فہرست

لمعات	ادارہ	3
تحریک طلوع اسلام کا تعارف	ادارہ	5
مذہب، الدین اور سیاست	غلام باری، مانچسٹر	18
پیش لفظ	محمد اشرف ظفر	22
حضرت انسان قرآن کے آئینے میں	آصف جلیل	24
زکوٰۃ کی ادائیگی کا مسئلہ	خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی	30
مطالب القرآن فی دروس الفرقان (۲۹واں پارہ)	غلام احمد پرویزؒ	35

ENGLISH SECTION

SOCIAL VALUE SYSTEM

By Maj Gen (Rtd) Ihsan-ul-Haq 1

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تحریک طلوع اسلام کا تعارف

﴿بانئ تحریک کے الفاظ میں﴾

تقسیم سے قبل گو طلوع اسلام کا مقصد تحریکِ پاکستان کی تائید تھا لیکن اس کی یہ تائید دورِ حاضرہ کی اصطلاح یا مفہوم میں ایک ''سیاسی مقصد'' کے حصول کے لئے نہیں تھی۔ طلوع اسلام کا مؤقف قرآنی تصور کی ہمنوائی میں یہ تھا کہ اسلام' ایک دین (یعنی نظامِ مملکت) کی شکل میں اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے جب مسلمانوں کی اپنی آزاد مملکت ہو جس میں قرآنی اقدار کی حکمرانی ہو۔ اس طرح یہ حصولِ پاکستان کی سیاسی جنگ کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کو ذہنوں میں جاگزیں کرتا چلا گیا کہ اسلام کا مقصود کیا ہے اور دین کا مطمحِ نگاہ کیا' وہ کس قسم کا ضابطۂ زندگی اور نظامِ حیات پیش کرتا ہے اور وہ ضابطہ یا نظام کس طرح دیگر نظامہائے حیات سے منفرد اور بے مثال ہے۔ وہ کیوں کسی اور ضابطہ سے مفاہمت نہیں کرسکتا اور اس میں کیوں کسی اور نظام کا پیوند نہیں لگایا جاسکتا۔

نظامِ خداوندی کو ایک آزاد خطۂ زمین پر مشہود کرنے کی یہی وہ حسین آرزو اور مقدس تمنا تھی جس کو لے کر حصولِ پاکستان کے بعد طلوع اسلام پھر جادہ پیما ہوا۔ اس کے نزدیک حصول مملکت کے بعد سب سے پہلا کام یہ تھا کہ دین کے جن امور کو وہ اب تک اصولی طور پر پیش کرتا چلا آیا ہے ان کے تمام پہلوؤں پر تفصیلی روشنی ڈال کر اس کے نمایاں خط و خال امت کو دکھائے اور قرآن ہی کی روشنی میں اس کے قیام کی موجودہ عملی صورت کا تعین کرے۔ طلوع اسلام کے پیشِ نظر دوسرا کام یہ تھا کہ وہ تمام سلیم قلب' سعید روحیں اور جو قرآنِ کریم کے اس حیات آفریں پیغام سے ہم نوا ہیں لیکن کسی مرکز کے نہ ہونے کے سبب تسبیح کے بکھرے ہوئے دانوں کی طرح ایک دوسرے سے بے خبر اطراف و جوانبِ ملک میں الگ الگ پڑی ہیں اور باوجود ہزار بار سوچنے کے آگے قدم نہیں اٹھا سکتیں کہ وہ اس میدان میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتی ہیں انہیں یک دلی اور ہم مشربی کے رشتۂ محکم میں منسلک کر کے ایک ذہنی مرکز پر جمع کرلیا جائے اور اس

طرح ان افراد کے اجتماع سے وہ قافلہ مرتب ہو جائے جس کا ہر قدم صحیح منزل کی طرف اٹھے۔

جہاں تک قرآنی نظامِ زندگی کے خط و خال کا تعلق ہے اس کی تفصیل طویل ہے اور اس مختصر وقت میں اسے پیش کرنا دشوار۔ محترم پرویز صاحب نے اس کو وضاحت کے ساتھ رسالۂ طلوع اسلام کے ہزار ہا صفحات اور بیسیوں کتابوں کی شکل میں نقش کر کے انہیں ملک میں عام کر دیا ہے اور جن کا چرچا آپ چہار اطرافِ عالم میں سنتے ہیں لیکن مختصر طور پر پرویز صاحب نے جو طلوع اسلام کے مقصد کی وضاحت میں پیش کیا ہے' یہ ہے:

(۱) دین کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسانوں سے خالص قوانین خداوندی کی اطاعت کرائے اور اس طرح کوئی انسان دوسرے انسان کی محکومی اور غلامی میں نہ رہے۔ خواہ یہ غلامی ذہنی اور فکری ہو اور خواہ طبعی اور اقتصادی۔

(۲) قوانینِ خداوندی کی اطاعت ایک نظام کی رو سے ہو سکتی ہے جسے استخلاف فی الارض (یا نظامِ مملکت) کہتے ہیں۔ قرآن کی رو سے استخلاف فی الارض کے بغیر دین کا تمکن ہو ہی نہیں سکتا۔

(۳) قرآن نے (بجز مستثنیات) دین کے اصولی قوانین دیئے ہیں اور اسے اس نظام پر چھوڑا ہے کہ وہ ان اصولوں کی روشنی میں اپنے وقت کے تقاضوں کے مطابق جزئیات خود متعین کرے۔

(۴) رسولؐ اللہ نے سب سے پہلے نظامِ قرآنی قائم کیا اور اپنے رفقائے کار (صحابہ کبار رضی اللہ تعالیٰ عنھم) کے مشورہ سے قرآن کے اصولی احکام کی جزئیات مرتب فرمائیں۔

(۵) رسول اللہ ﷺ کے بعد دین کا یہی نظام حضور ﷺ کے خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنھم نے جاری رکھا جو امورِ ملت کو ملت کے مشورہ سے سرانجام دیتے تھے۔ قرآن کے جن اصولوں کی جزئیات اس سے پہلے متعین نہیں ہوئی تھیں انہوں نے ان کا تعین کیا جن میں کسی ردوبدل کی ضرورت تھی ان میں ضروری تغیر و تبدل کیا' جن میں ایسی ضرورت نہیں تھی انہیں علیٰ حالہٖ باقی رکھا۔

(۶) بدقسمتی سے خلافت علی منہاجِ نبوت کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے بعد منقطع ہو گیا اور دین کا قرآنی نظام باقی نہ رہا' اس سے امت میں انتشار پیدا ہو گیا جس میں ہم اس وقت تک مبتلا ہیں۔ اب کرنے کا کام یہ ہے کہ پھر سے اسی انداز کا نظام قائم کیا جائے جو امت کو قرآن کے مطابق چلائے۔

(۷) جب تک اس قسم کا نظام قائم نہیں ہوتا امت کے مختلف فرقے' جزئیات پر جس جس انداز سے عمل پیرا

ہیں کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ ان میں کسی قسم کا رد و بدل کرے۔ یہ حق صرف قرآنی نظام کو پہنچتا ہے کہ وہ ان اختلافات کو مٹا کر پھر سے امت میں وحدت پیدا کرے۔ اس دوران میں اتنا ہی کیا جا سکتا ہے کہ دین کے اس تصور کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے اور ہم میں جو عقائد و رسومات ایسی رائج ہو چکی ہیں جو قرآن کے خلاف ہیں ان کی طرف توجہ دلائی جائے تاکہ جو لوگ قرآن کے مطابق زندگی بسر کرنے کا جذبہ اپنے اندر رکھتے ہوں وہ اپنی اصلاح کرتے چلے جائیں۔

(۸) قرآن تمام نوعِ انسانی کے لئے واحد اور مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ اس کے ساتھ وحی کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ لہٰذا نہ قرآن کے بعد خدا کی طرف سے کوئی اور کتاب آ سکتی ہے، نہ رسول اللہ ﷺ کے بعد کوئی اور نبی یا رسول۔

(۹) قرآن کا ہر دعویٰ علم پر مبنی ہے اور اس کے حقائق زمان و مکان کی حدود سے ماوراء۔ قرآنی حقائق کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اپنے زمانہ تک مختلف علوم وفنون جس حد تک ترقی کر چکے ہیں وہ سب انسان کے سامنے ہوں اور چونکہ قرآن کا ارشاد ہے کہ یہ تمام کائنات انسان کے لئے تابع تسخیر کر رکھی ہے اس لئے خدائی پروگرام کو پورا کرنے کے لئے کائناتی قوتوں کی تسخیر لاینفک ہے۔

(۱۰) نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مقدسہ، شرفِ انسانیت کی معراج کبریٰ کی مظہر تھی لیکن بدقسمتی سے ہماری کتب روایات و تاریخ میں ایسی باتیں شامل ہو گئی ہیں جن سے حضور ﷺ کی سیرت داغدار ہو کر سامنے آتی ہے۔ آپ کی سیرتِ طیبہ کا جو حصہ قرآن کے اندر محفوظ ہے اس کے قطعی اور یقینی ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ باقی رہا وہ حصہ جو قرآن کے باہر ہے سو اس میں اگر کوئی بات ایسی ہے جو قرآن کے خلاف جاتی ہے یا جس سے حضور ﷺ پر کسی قسم کا طعن پایا جاتا ہے تو وہ بات ہمارے نزدیک وضعی ہے اور حضور ﷺ کی طرف غلط منسوب۔ ضرورت ہے کہ سیرتِ نبویؐ کے صحنِ چمن سے ان کانٹوں کو الگ کر دیا جائے۔ جو روایات نہ قرآن کے خلاف ہیں اور نہ ہی ان سے حضور ﷺ کی سیرتِ مقدسہ پر کسی قسم کا حرف آتا ہے انہیں ہم صحیح مانتے ہیں۔

(۱۱) ہم دین میں فرقہ سازی کو شرک سمجھتے ہیں اس لئے ہم کوئی فرقہ پیدا نہیں کرنا چاہتے، احکامِ اسلامی کے متعلق البتہ ہم یہ ضرور کہتے ہیں کہ ان کی پابندی محض ایک رسم کے طور پر نہیں کرنی چاہئے بلکہ ان کی روح پر بھی نگاہ رکھنی چاہئے۔

(۱۲) قرآنی نظام کا مقصود یہ ہے کہ انسان کی مضمر صلاحیتوں کی پوری پوری نشوونما ہو جائے تاکہ نوعِ انسانی

اس زندگی میں سر اٹھا کر چلنے اور اس کے بعد کی زندگی میں شرفِ انسانیت کے باقی مراحل طے کرنے کے قابل ہو سکے۔

(۱۳) قرآنی نظام میں تمام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری معاشرہ پر ہوتی ہے اس اہم فریضہ کی ادائیگی کے لئے ضروری ہے کہ وسائل پیداوار معاشرہ کی تحویل میں رہیں نہ کہ افراد کی ذاتی ملکیت میں جس میں معاشرہ کوئی دخل نہ دے سکے۔ یاد رہے کہ یہ تصور کمیونزم یا سوشلزم کے تصور سے یکسر مختلف ہے جس میں انسان کی طبعی زندگی کے علاوہ کسی اور زندگی کا تصور ہی نہیں ہوتا۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن کا نظامِ ربوبیت نہ سرمایہ داروں کے لئے خوش آئند ہوسکتا ہے نہ کمیونسٹوں کے لئے۔

یہ تھے دینِ خداوندی کے وہ خط وخال جنہیں طلوع اسلام..... نہایت مستقل مزاجی سے عوام کو دکھاتا رہا اور یہی تھی آہن کی وہ فسان جس سے ریت میں ملے ہوئے فولادی ذرات تڑپ تڑپ کر ریت سے الگ ہو گئے اور کہکشانی ستاروں کی طرح اس حیات آفریں پکار پر کھنچے چلے آئے۔

انہی افراد پر مشتمل تنظیمی ہیئت کا نام ''بزم طلوع اسلام'' ہے۔ ان بزموں کا مقصد اور مشن طلوع اسلام کی طرف سے پیش کردہ قرآنی فکر کو عام کرنا ہے۔

قرآنی پیغام کے عام کرنے کے سلسلہ میں ہمارے سامنے یہ حقیقت آئی کہ جب کوئی شخص جذبات سے مغلوب ہو جائے تو وہ کوئی معقول بات سننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ وہ اس موڈ میں ہی نہیں ہوتا کہ پیش آمدہ مسائل پر عقل و بصیرت کی رو سے غور کرے اور دلائل و براہین کے مطابق کسی فیصلے پر پہنچے۔ افراد کے مجموعے ہی کا نام قوم ہوتا ہے ور جب اقوام بھی جذبات کے سیلاب میں بہہ جائیں تو یہی چیز ان کی تباہی کا موجب بن جاتی ہے۔ اس وقت ہماری قوم بھی تباہی کے اسی غار کی طرف رواں دواں چلی جا رہی ہے اور بری طرح جذبات کے سیلاب میں بہی جا رہی ہے۔ یوں تو مغرب کی خدا فراموش سیاست کی بدولت انتخابات کی وبا ہر جگہ آندھی بن کر اٹھتی اور جھکڑ بن کر چھا جاتی ہے۔ لیکن ہمارے یہاں بدقسمتی سے اس نے اور ہی شکل اختیار کر لی ہے۔ یہاں ایک طبقہ انسان کی طبیعی ضروریاتِ زندگی کے حصول کو اپنا مطمح نظر بنائے ہوئے ہے اور صرف اسی میں انسانیت کے فلاح و بہبود کا راز بتاتا ہے اور اس کے حصول کے لئے وہ اپنی ہر چیز کو داؤں پر لگائے بیٹھا ہے۔ دوسری طرف نظریۂ پاکستان کے مخالفین عوام کے ان جذبات کو مشتعل کرنے میں پوری شدت سے سرگرمِ عمل

ہیں جن کا تعلق قلبِ انسان کے نہایت نرم و نازک گوشوں سے ہوتا ہے۔ ان حالات کے پیشِ نظر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تحریکِ طلوعِ اسلام کے مقاصد کو ایک بار پھر دہرا دیا جائے۔ یہ ضرورت اس لئے اور بھی اہم ہو جاتی ہے کہ تحریکِ طلوع اسلام دینِ خداوندی کے فروغ اور نظامِ ربوبیت کے قیام وعمل کی پیامبر ہے ان حالات میں ایک طرف مذہب پرست طبقہ ہم سے متقاضی ہے کہ' دین خطرہ میں ہے۔ اس لئے آپ ہمارے ساتھ مل کر ان کا مقابلہ کیجئے۔ دوسری طرف سرمایہ داری کے ظلم و استبداد اور مذہبی پیشوائیت کی خون آشامیوں' عیاریوں اور مکاریوں کا شکار طبقہ ہم سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ تم نظامِ ربوبیت کے پیامبر ہو اس لئے سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کو دفن کرنے میں ہم سے تعاون کیوں نہیں کرتے۔ تیسری طرف تحریک میں شامل وہ نئے نوجوان ہیں جن کی بے تابیٔ تمنا دبی زبان سے یہ شکوہ کرتی ہے کہ قرآن کے نظامِ ربوبیت کے قیام کے لئے ہماری موجودہ رفتار نہایت سست ہے۔ اس کے لئے ہمیں باہر نکلنا چاہئے۔ سوشل ورک کر کے ہمیں عوام کی ہمدردیاں حاصل کرنی چاہئیں اور یوں عوام کی طاقت حاصل کر کے غیر قرآنی نظامِ کہن کی جگہ دینِ خداوندی کا نفاذ کرنا چاہئے۔

اندریں حالات' ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ تحریکِ طلوع اسلام کے مقاصد' نصب العین اور اس کے حصول کے لئے طریقِ کار کو مختصر طور پر خود بانیٔ تحریک کے الفاظ میں پیش کر دیں۔

دستور اساسی و اصولی ہدایات برائے بزمہائے طلوع اسلام کی پہلی شق یہ ہے:۔۔

''بزمِ طلوع اسلام نہ کوئی سیاسی پارٹی ہے نہ مذہبی فرقہ' یہ ایک اجتماعی کوشش ہے اس قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے لئے جسے ادارۂ طلوع اسلام کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ اسلام میں جو غیر قرآنی تصورات شامل ہو گئے ہیں' انہیں الگ کر کے پھر سے اس نظام کی تشکیل کے لئے فضا سازگار بنائی جائے جو عہد محمد رسول اللہؐ والذین معہٗ میں قائم ہوا تھا۔''

چنانچہ طلوع اسلام کی پہلی کنونشن منعقدہ ۱۹۵۶ء میں محترم پرویز صاحب نے اپنے خطاب میں فرمایا:

''اس کے بعد میں اس کے دوسرے گوشے کی طرف آتا ہوں جو اس پہلے گوشے سے بھی زیادہ نازک اور لطیف ہے۔ لطیف اتنا کہ بعض اوقات اسے صحیح طور پر سمجھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ گوشہ یہ ہے کہ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت اور اس

کے ذریعے معاشرہ میں انقلاب بغیر گروہ بندی اور پارٹی بازی کے برپا کیا جائے۔ چونکہ دور حاضرہ میں معمول یہ ہے کہ کوئی تحریک بغیر پارٹی بازی کے وجود میں نہیں آتی اس لئے یہ بات ذرا مشکل سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ پارٹی بازی کے بغیر بھی کوئی تحریک چل سکتی ہے۔ لیکن برادران! قرآن کریم سے جو کچھ تھوڑی بہت بصیرت میں نے حاصل کی ہے اس کی روشنی میں، میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ملت کے اندر تعمیری انقلاب پیدا کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ کوئی پارٹی بنائے بغیر ان میں فکری تبدیلی پیدا کرتے جائیں.....

قرآن کریم غیر مسلموں کے مقابلہ میں مومنین کو الگ جماعت، ایک جداگانہ امت قرار دیتا ہے لیکن وہ اس امت کے اندر فرقہ سازی کو شرک قرار دیتا ہے، بعض احباب کہتے ہیں کہ قرآن مذہبی فرقہ کو تو شرک قرار دیتا ہے، سیاسی پارٹی کو شرک نہیں ٹھہراتا، ذرا سوچئے کہ جس اسلام میں مذہب اور سیاست دو الگ الگ شعبے ہی نہیں اس میں مذہبی فرقہ اور سیاسی پارٹی میں کیا فرق ہوسکتا ہے؟ لہٰذا مذہبی فرقہ ہو یا سیاسی پارٹی دونوں تفریق فی الدین ہیں۔ پھر کہا یہ جاتا ہے کہ جو مقصد ہمارے سامنے ہے اس کے لئے اجتماعی کام کی ضرورت ہے، انفرادی کوششوں سے کچھ نہیں ہوسکتا۔ اگر پارٹی بنانا منع ہے تو یہ اجتماعی کام کس طرح سے ہو سکے گا۔ یہ اجتماعی کام منظّم کوشش (Organised Effort) سے ہو سکے گا۔ اب سوال یہ پیدا ہوگا کہ پارٹی بازی اور منظّم کوشش میں کیا فرق ہے؟ اس فرق کو سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔ قرآن نے تحزب (پارٹی بازی) کی نفسیات کو چند الفاظ میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے جہاں کہا ہے کہ: کل حزب بما لدیھم فرحون (۳۰/۳۲)۔ پارٹی کی عمارت تعصب کی بنیادوں پر اٹھتی ہے اور دوسروں سے نفرت کے جذبہ پر استوار ہوتی ہے۔ ہر پارٹی کے ممبر یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا بھر کی سعادتیں اور حسنات ان کی پارٹی میں جمع ہیں اور پارٹی سے باہر جتنے لوگ ہیں ان میں کوئی خوبی اور نیکی نہیں۔ اس سے ان کے اندر نخوت اور تکبر پیدا ہو جاتا ہے اور وہ دوسروں کو سخت ذلت اور حقارت کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ لیکن انہی ذلیل اور حقیر لوگوں میں سے جب کوئی ان کی پارٹی میں شامل ہو جاتا ہے تو وہ ہر قسم کے شرف و

مجد کا حامل بن جاتا ہے۔ پھر اس میں دنیا بھر کی خوبیاں آ جاتی ہیں۔ اگر وہ پارٹی کے ساتھ وفا شعار (Loyal) رہتا ہے تو اس کا ہر عیب ہنر دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اگر اس نے پارٹی سے قطع تعلق کر لیا تو نہ صرف یہ کہ اس کی ہر خوبی عیب بن جاتی ہے بلکہ دنیا بھر کے عیب اسکی طرف منسوب کر دیئے جاتے ہیں اور اسے جی بھر کر بدنام کیا جاتا ہے۔ یہی وہ ڈر ہے جس کی وجہ سے لوگ پارٹیوں کے ساتھ متمسک رہتے ہیں۔ اپنی پارٹی کی تقویت ہر رکن کا اولین فریضہ ہوتا ہے اور اس کے لئے ہر قسم کا جائز و ناجائز حربہ استعمال کرنا عین جہاد سمجھا جاتا ہے۔ دوسروں کی بات کتنی ہی معقول کیوں نہ ہو، وہ اسے کبھی نہیں سنتے اور اگر کبھی مجبوراً سننا پڑے تو اس کا تمسخر اڑاتے اور استہزاء کی ہنسی ہنستے ہیں۔ ان کی مجلسوں کا محبوب ترین مشغلہ دوسروں کی تذلیل و تحقیر ہوتا ہے، جس میں وہ بڑی لذت لیتے ہیں ..... یہ ہیں وہ عناصر جن سے ایک پارٹی ترتیب پاتی اور قائم رہتی ہے۔ لیکن قرآنی نظام کے لئے منظّم کوشش کا تصور اس سے یکسر مختلف ہے۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے قرآنی نظام کی حقیقت کو سمجھ لیا ہے اور جن کی آرزو یہ ہے کہ یہ نظام پھر سے ملت میں متشکل ہو جائے، وہ سب سے پہلے اس کی بنیادی خصوصیات خود اپنے اندر پیدا کریں اور پھر اس نظام کے تصور کو دوسرے لوگوں تک پہنچائیں۔ اس نظام کا بنیادی اصول یہ ہے کہ دنیا میں تمام افرادِ انسانیہ کی ضروریات زندگی پوری ہوں اور ان کی مضمر انسانی صلاحیتوں کی مکمل نشوونما ہوتی جائے۔ اس نظام کے متشکل کرنے والوں کا فریضہ یہ ہے کہ وہ دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیں اور دوسروں کی نشوونما میں اپنی ذات کی بالیدگی اور ارتقاء کا راز سمجھیں۔ ظاہر ہے کہ جو افراد اس مقصد کے حصول کے لئے منظّم کوشش کرنے کے لئے اٹھیں، ان میں پارٹی بازی کی لعنتوں میں سے کسی کا شائبہ تک بھی نہیں ہوگا۔ وہ دوسروں سے نفرت نہیں، ہمدردی کریں گے۔ وہ ان کی بہبود کا سامان مہیا کرتے پھریں گے۔ وہ اس میں اپنے اور پرائے کی کوئی تمیز روا نہیں رکھیں گے۔ وہ اپنے کام کی ابتدا بے شک کسی ایک مقام سے کریں گے لیکن پوری نوعِ انسانی ان کی برادری اور ساری دنیا ان کا گھر ہوگی۔

ان کی مساعی' خدا کی صفتِ رب العالمینی کی مظہر ہوں گی۔ اس میں ان کے ذمہ زیادہ سے زیادہ ایثار اور قربانیاں ہوں گی اور دوسروں کے لئے بیش از پیش نفع بخشیاں اور راحت سامانیاں''۔

ایک دوسرے مقام پر پرویز صاحب نے فرمایا:

''قرآنِ کریم اس نظام کے قیام کے لئے ذرائع بھی کوئی ایسے استعمال نہیں کرنے دیتا جو مستقل اقدار کے خلاف ہوں' اس کے نزدیک جس طرح غلط راستہ صحیح منزل تک نہیں پہنچ سکتا' اسی طرح غلط ذریعہ سے صحیح مقصد حاصل نہیں ہوسکتا۔ وہ ذریعہ اور مقصد میں فرق ہی نہیں کرتا''۔

ایک اور مقام پر موصوف نے کہا:

''حقیقت یہ ہے کہ مادی نظریۂ حیات کی رو سے' انقلاب کے لئے تشدد کے علاوہ اور کوئی ذریعہ کارگر ہو نہیں سکتا لیکن قرآنی نظریۂ زندگی کی رو سے احترام انسانیت' انسانی ذات پر ایمان کا بنیادی تقاضا ہے۔ یہ ظلم و استبداد کی قوتوں کی دراز دستیوں کو روکنے کے لئے قوت کے استعمال کی اجازت دیتا ہے۔ نظریۂ زندگی کی تبدیلی کے لئے قوت کے استعمال کی اجازت نہیں دیتا۔ اس لئے کہ قوت کے استعمال سے نظریہ میں تبدیلی نہیں آسکتی۔ یہ تبدیلی یقین (Conviction) سے آتی ہے اور (Conviction) کی بنیاد دلائل و براہین کی رُو سے دل و دماغ کے اطمینان پر ہے۔ اسی کو قرآن کی اصطلاح میں ایمان کہتے ہیں''۔

''دنیا میں ساری قوتوں کا راز' ایمان میں مضمر ہے۔ جس قدر آپ کا یقین محکم ہے اسی قدر ناقابلِ تسخیر قوتوں کے آپ مالک ہیں۔ شکست و کامرانی کا بنیادی مدار ساز و سامان پر نہیں' یقین اور عدمِ یقین پر ہے۔ جن لوگوں کو اپنے مقاصد کی صداقت پر غیر متزلزل یقین ہوگا وہی دنیا میں کامیاب و شادکام ہوں گے۔ یہی شکست و فتح کا اٹل پیمانہ ہے۔ اسی سے قوموں کا مستقبل ماپا جاتا ہے۔ جب یقین ایمان کے درجہ تک پہنچ جائے اور ایمان ہو اللہ واحد القہار پر تو پھر دنیا کی کوئی طاقت آپ کو اپنے مقام سے نہیں ہلاسکتی''۔

''(نظام خداوندی) کے قیام کی پہلی منزل شعور کی بیداری ہے۔ شعور کی یہ بیداری اور فکر و نظر کی یہ تبدیلی اس نظام کے تصور کے عام کرنے میں اور اس کے درخشندہ اور تابناک نتائج کو نگۂ

بصیرت کے سامنے لانے سے ہوتی ہے۔ اسی کا نام تعلیم کتاب وحکمت ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے اسی نقطۂ سے آغاز کار کیا تھا..... اس تصور کو عام کرنے سے ایسے' سعادت مند افراد نتھر کر الگ ہو جاتے ہیں جن کی نگاہوں میں کشادگی اور قلب میں وسعت ہوتی ہے۔ اسی کا نام نفس کی بالیدگی ہے اور تعلیم وحکمت کے ساتھ اس کا چولی دامن کا تعلق ہے''۔

تعلیم وحکمت کی وضاحت کرتے ہوئے پرویز صاحب نے لکھا:

''تعلیم کا تعلق بالعموم انسانی ذہن سے ہوتا ہے اور تزکیہ کا تعلق قلبِ انسانی سے۔ کسی حقیقت کو اس انداز سے واضح کر دینا کہ وہ دوسرے کی سمجھ میں آ جائے' تعلیم ہے۔ تعلیم سے ذہنی بصیرت تو حاصل ہو سکتی ہے قلبی ایقان نہیں۔ دنیا میں انقلاب پیدا کرنے کے لئے ذہنی جلا ہی کافی نہیں ہوتی' اس کے لئے قلبی تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہے جو درحقیقت اعمالِ انسانی کا سرچشمہ ہے' جس سوسائٹی کے نظام کی بنیاد تزکیۂ قلب وتطہیرِ فکر پر نہیں وہ نظام کبھی نشوو ارتقاء انسانیت کا کفیل نہیں ہو سکتا۔ اس کا نتیجہ ہمیشہ فساد ہوگا۔ بہترین دساتیر وقوانین بھی اطمینان بخش نتائج مرتب نہیں کر سکتے جب تک ان قوانین کو نافذ کرنے والی جماعت اور ان پر عمل کرنے والی قوم کے قلب و نگاہ کی اصلاح نہ ہو چکی ہو۔ عمل کا محرک جذبہ' قوتِ ارادی ہے اور قوتِ ارادی کا تعلق دل سے ہے' دماغ سے نہیں۔ اس لئے تنہا علم عمل کا محرک نہیں ہو سکتا۔ قرآن اس قسم کی سوسائٹی تشکیل کرتا ہے جو اطاعتِ احکام میں اپنی ذات کی تسکین محسوس کرے۔ قلب کی اس کیفیت کا نام تزکیہ ہے۔ جب قرآن قلب کی گہرائیوں میں اتر جائے تو انسان کی نگاہ کا زاویہ بدل جاتا ہے اور داخلی دنیا کی اس تبدیلی سے خارجی دنیا میں انقلابِ عظیم آ جاتا ہے۔ قرآن یہی انقلاب پیدا کرتا ہے''۔

(موصوف نے کہا)۔ ''قرآنی انقلاب کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہنگامی شورشیں برپا کرنا نہیں سکھاتا۔ وہ اپنی اساس فکری تبدیلی پر رکھتا ہے جسے وہ علیٰ وجہ البصیرت پیدا کرتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ان جذبات کی بھی حسن کارانہ انداز سے پرورش اور تربیت کرتا ہے جو انقلاب کے محرک ہوتے ہیں۔ وہ قلب اور دماغ' عقل اور عشق' جنون اور خرد' ذکر اور فکر' خبر اور نظر'

دلائل اور جذبات کے صحیح امتزاج سے داخلی اور خارجی دنیا میں ایسی تبدیلی پیدا کرتا ہے جس میں ہر قدم تعمیر کے لئے اٹھتا ہے اور جو چیزیں بظاہر تخریبی نظر آتی ہیں' وہ بھی درحقیقت تعمیر ہی کی تمہید ہوتی ہیں۔ ''جنون اور خرد'' جیسے متضاد عناصر میں ہم آہنگی پیدا کر کے انہیں ایک بے پناہ قوت کا امین بنا دینا قرآن کی بنیادی خصوصیت ہے۔۔۔ اس قسم کا عقل اور جنون کا امتزاج جس میں نہ تو جنون مذہبی دیوانگی سکھا دے اور نہ ہی عقل اس جنون کی چنگاری کو اپنی خاکستر کے نیچے دبا کر بجھا دے' قرآن کے علاوہ اور کہیں نہیں مل سکتا۔ یہی ہیں وہ اربابِ ''خرد و جنون'' جنہیں وہ اولی الالباب الذین یذکرون اللہ قیاماً و قعودا و علیٰ جنوبھم ویفکرون فی خلق السمٰوٰت و الارض۔ (3/190) سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی وہ اربابِ عقل و بصیرت جو زندگی کی ہر ساعت اور ہر گوشے میں وحی کی راہنمائی کو بھی پیشِ نظر رکھتے ہیں اور کائنات کی گہرائیوں اور بلندیوں پر بھی غور و فکر کرتے ہیں' یہی ہیں وہ مکمل عدل کا ''خواب'' دیکھنے والے جو اس ''خواب'' کو ایک زندہ حقیقت بنا کر رکھ دینے کے اہل ہوں''۔

طلوع اسلام کی دوسری سالانہ کنونشن سے خطاب کرتے ہوئے پرویز صاحب نے فرمایا:

''جو جماعت قرآنی نظامِ ربوبیت کی تشکیل کا عزم لے کر اٹھتی اور اپنے اللہ سے بیع و شریٰ کا معاملہ کرتی ہے اس کے نفع اور نقصان کے ماپنے کے پیمانے اور اندازے دوسری جماعتوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ عام جماعتوں کو صرف یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ انہوں نے کتنے ممبر بھرتی کئے۔ کس قدر روپیہ فراہم کیا۔ کتنے جلسے کئے' کتنے جلوس نکالے' مخالفین کو دبانے کے لئے کون کون سے حربے استعمال کئے اور اس طرح انتخابات میں کتنی نشستیں حاصل کیں وغیرہ وغیرہ۔ لیکن قرآنی نظام کی داعی جماعت کے افراد کو دیکھنا یہ ہوگا کہ انہوں نے اپنے اندر کس قدر تبدیلی پیدا کی ہے۔ ان کا قلب و دماغ کس حد تک قرآنی تصورات سے ہم آہنگ ہو چکا ہے۔ ان کی سیرت و کردار کہاں تک قرآنی قالب میں ڈھل چکے ہیں۔ ان کی آرزوؤں اور ارادوں کے محرکات کس حد تک قرآنی مقاصد ہیں' وہ اپنی ذات' اپنے اعزہ و اقارب اور دوسرے انسانوں کے ساتھ معاملات میں قوانینِ خداوندی کی کس قدر نگہداشت کرتے ہیں۔ اگر ہمارے اندر اس قسم کی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی تو پھر

آپ نے دوسرے معیاروں کے مطابق کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر لی ہو' قرآن کی میزان میں اس کا کوئی وزن نہیں''۔

طلوع اسلام کی ساتویں کنونشن میں موصوف نے کہا:

''انسانی تاریخ میں یہ وقت بڑا نازک آیا ہے' قدیم تصوراتِ حیات اور نظامہائے زندگی کا دور دورہ ختم ہو رہا ہے' ملوکیت' سرمایہ داری' مذہب' سب ایک ایک کر کے اٹھتے اور مٹتے جا رہے ہیں..... اس وقت لا کی طوفانی قوتیں (کمیونزم وغیرہ) بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہیں۔ اگر الا اللہ کا تصور اس وقت سامنے نہ لایا گیا تو انہیں اس کے بعد' ان کے مقام سے ہٹانے' یا الا اللہ تک لانے میں نہ معلوم کتنا وقت لگ جائے اور انسانیت کو کتنا عرصہ اس جہنم میں گزارنا پڑے جس میں وہ صدیوں سے پڑی جھلس رہی ہے''۔

طلوع اسلام کی نویں کنونشن کو خطاب کرتے ہوئے پرویز صاحب نے فرمایا:

''یہ ہے عزیزانِ گرامی قدر! مختصر الفاظ میں میری وہ دعوت جسے میں قریب تیس سال سے مسلسل پیش کئے چلا آ رہا ہوں۔ جس دن میں نے اس قرآنی فکر کو پیش کرنے کا فیصلہ کیا تھا' مجھے اس کا اچھی طرح سے علم تھا کہ اس کی کس قدر مخالفت ہوگی۔ جو شخص لوگوں کے سامنے ان کے مروجہ عقائد اور متوارث نظریات پیش کرتا ہے' پہلے ہی دن ایک انبوہِ کثیر اس کے ساتھ ہوتا ہے' اسے ان کا مسلمہ لیڈر' راہنمائے شریعت یا مرشد طریقت بن جانے میں کسی قسم کی کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ لیکن جو شخص ان کے غلط عقائد اور غیر صحیح اعمال کی تردید کر کے' انہیں ایسے راستے کی طرف دعوت دیتا ہے جو ان کی پامال راہوں سے ہٹا ہوا ہے' وہ دنیا بھر کی مخالفت مول لیتا ہے۔ میری اپنی پہلی زندگی خود انہی پامال راہوں میں گزری تھی اس لئے ایک ہجوم کو اپنے پیچھے لگا لینا' اور ایک بہت بڑی جماعت کھڑی کر کے اسکا قائد بن جانا' میرے لئے کچھ بھی مشکل نہیں تھا لیکن میری قرآنی بصیرت کچھ اور کہہ رہی تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے توفیق بخشی کہ میں ان تمام نگاہ فریب جاذبیتوں اور دامن گیر کششوں سے منہ موڑ کر' قرآن کی آواز پر لبیک کہوں' اور اس طرح دنیا جہان کی مخالفت مول لے لوں' میں نے یہ فیصلہ سب کچھ جانتے بوجھتے'

سوچتے سمجھتے کیا اور مجھے کبھی اس پر افسوس نہیں ہوا۔

سوال یہ ہے کہ میں نے مقبولیتِ عامہ کا وہ آسان راستہ چھوڑ کر ان پُرخار وادیوں کو اختیار کیوں کیا۔ اس کا بنیادی جواب تو یہی ہے کہ جب کسی کے سامنے صداقت آ جائے تو خود صداقت کا تقاضا ہوتا ہے کہ اسے عام کیا جائے خواہ اس میں کتنی ہی مشقتیں کیوں نہ برداشت کرنی پڑیں۔ دوسرے یہ کہ تاریخِ اقوام کے مطالعہ سے میں اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ چکا ہوں کہ اب مذہب کا دور ختم ہو چکا ہے۔[1] مذہب تاریکیوں میں پنپتا ہے جوں جوں علم کی روشنی پھیلتی جاتی ہے' مذہب چمگادڑ کی طرح آنکھیں بند کرتا چلا جاتا ہے۔ بادنیٰ تدبر یہ حقیقت سامنے آ جائے گی کہ دنیا کے تمام مذاہب ایک ایک کر کے ختم ہو گئے یا ختم ہوتے جا رہے ہیں۔۔۔ بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں۔

یہ تو دین کا خاصا ہے کہ وہ علم کی روشنی میں اور زیادہ چمکتا ہے۔ جیسے کہ میں نے شروع میں کہا ہے ہم بھی اپنے دین کو مذہب کی سطح پر لے آئے ہیں' اس لئے جب دنیا کے دیگر مذاہب باقی نہ رہے' تو یہ مذہب کیسے باقی رہ سکے گا؟ فطرت کے قانون کے مطابق' ہر وہ نظریہ جو زمانے کے تقاضوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا' اپنی موت آپ مرجاتا ہے۔

مذہب کے ختم ہو جانے کے بعد' اگر اس قوم کے سامنے دین نہ ہو' تو وہ دہریت اختیار کر لیتی ہے' اس وقت یورپ کی سیکولر مملکتوں اور کمیونسٹ سلطنتوں کے ساتھ یہی ہوا ہے۔ ان دونوں میں سیاست' مستقل اقدار سے الگ ہو جاتی ہے اور اس کا نتیجہ (علامہ اقبالؔ کے الفاظ میں) ''چنگیزیت'' کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

دہریت کا خاصا یہ ہے کہ وہ خاص اسی قوم کو تباہ نہیں کیا کرتی' اس کا اثر بڑا دوررس ہوتا ہے۔ جب اقتدار کسی ایسی قوم کے ہاتھ آ جائے جو مستقل اقدارِ حیات پر ایمان نہ رکھتی ہو' تو اس سے دنیا جس جہنم میں مبتلا ہو جاتی ہے اس کے شعلے ہم آج ساری دنیا میں مشتعل دیکھ رہے ہیں۔ میری نگہِ بصیرت یہ دیکھ رہی ہے کہ مذہب کے ساتھ جو کچھ یورپ میں ہوا ہے' وہی کچھ اب پاکستان میں ہونے والا ہے۔ مجھے خطرہ ہے کہ

اگر اس وقت قوم کے سامنے خدا کا دین نہ لایا گیا تو یہاں بھی دہریت چھا جائے گی۔ میری انتہائی آرزو اور کوشش یہ ہے کہ قبل اس کے کہ دہریت کا بڑھتا ہوا سیلاب ادھر کا رخ کرے' یہاں مذہب کو دین سے بدل دیا جائے تاکہ دنیا میں ایک خطہ زمین تو ایسا ہو جو خدا کی پروردگاری کا مظہر بن سکے''۔

طلوع اسلام کی دسویں سالانہ کنونشن میں پرویز صاحب نے اراکین بزمہائے طلوع اسلام کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

''میں نے زمیلانِ گرامی قدر! قرآن کریم کی اس روشنی کو چراغِ راہ بناتے ہوئے اس تحریک کی بنیاد رکھی تھی۔ اس کا مقصد' نہایت سکون و خامشی' لیکن انتہائی التزام و استحکام کے ساتھ' قرآنی فکر کو عام کئے جانا ہے۔ اس میں کسی قسم کی ہنگامہ آرائی اور تماشہ گری کا کوئی دخل نہیں۔ ہمارے دستور اساسی کی ایک شق یہ ہے کہ ہم عملی سیاسیات میں حصہ نہیں لیں گے اس لئے اس تحریک کے ساتھ وابستگی سے نہ تو کوئی سیاسی مفاد عاجلہ حاصل ہو سکتے ہیں اور نہ ہی اس میں نمود و نمائش کی کوئی گنجائش اور شہرت و ناموری کا کوئی مقام ہے۔ یہاں تو دنیا بھر کی مخالفت کو نہایت سکون و اطمینان سے برداشت کرنا' اور لب تک ہلائے بغیر اپنی دھن میں آگے بڑھتے چلے جانا ہے' اس بزمِ شوق میں پروانے کی طرح جل کر مر جانا اور زبان سے اُف تک نہ کرنا ہے' دوسری طرف مفاد عاجلہ کے جہانِ رنگ و بو سے یوں بیگانہ وار گزر جانا ہے کہ اس کی کوئی کشش و جاذبیت آپ کی دامنگیر نہ ہو''۔

یہ ہیں قرآنی حقائق پر استوار اس تنظیم کے مقاصد' اور یہ ہے وہ مخصوص اور متعین طریقِ کار (ذہنی انقلاب اور پھر قلبی انقلاب) جسے اس تحریک نے اپنے روزِ اول سے اختیار کر رکھا ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں آپ خود فیصلہ فرما لیجئے کہ اس قسم کی تحریک آپ کے تعاون کی مستحق ہے یا نہیں۔

والسلام!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غلام باری، مانچسٹر

مذہب، الدین اور سیاست

غیر ممکن ہے کہ حالات کی گتھی سلجھے
اہلِ دانش نے بہت سوچ کے الجھائی ہے

مذہب کے متعلق یہ ایک عام خیال ہے کہ مذہب خدا اور بندے کے درمیان ایک ذاتی تعلق کا نام ہے اسے دنیاوی معاملات سے کیا واسطہ؟ مذہب کا دائرہ، پرستش، پوجا پاٹ، نماز، روزہ، نیک عملی اور خدا پرستی تک محدود ہے۔ اس سے آگے دنیاوی معاملات ہیں۔ ان معاملات میں مذہب کو دخل انداز نہیں ہونا چاہئے۔ اسے سیکولرازم کہا جاتا ہے۔ یہ خیال نیا نہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر آخری نبی ﷺ تک خدا کا عطا کردہ **الدین** جہاں اور جب بھی پیش کیا گیا خود ساختہ قوانین پر چلنے والے انسانوں نے بالخصوص مذہبی پیشواؤں نے ہمیشہ یہی کہا کہ ''مذہب کو ان معاملات سے کیا تعلق؟''۔

خدا کی عبادت (بمعنی پرستش، پوجا پاٹ) سے دنیا میں کوئی نہیں روکتا۔ اس سے دوسروں کا بگڑتا کیا ہے۔ آپ صبح سے شام تک اس شکل کی عبادت کرتے رہئے آپ کو کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ یہ وہ چیز ہے جس کی ہر جگہ آزادی ہے لیکن جب آپ خدا کی عبادت (بمعنی عبودیت، محکومیت) یعنی انسانوں کے بجائے، قوانینِ خداوندی کی محکومیت کو نظامِ خداوندی (الدین) کی حیثیت سے اختیار کریں گے تو مستبد قوتیں کبھی اس کی اجازت نہیں دیں گی۔ اس لئے کہ دنیا کا نظامِ استبداد انسانوں کو حق دیتا ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کو خود ساختہ قوانین کے مطابق اپنی مرضی کے مطابق چلائیں۔ لیکن اللہ کا نظام (یعنی الدین) انسانوں سے یہ حق چھین کر اس ذات کے سپرد کر دیتا ہے جو حکومت کی فی الواقعہ سزاوار ہے لہٰذا دوسروں پر اپنی مرضی چلانے کا خوگر انسان اسے کس طرح گوارا کر سکتا ہے؟ یہ ہے وہ جذبہ محرکہ جس کے تحت مستبد قوتوں کی ہمیشہ یہ خواہش رہتی ہے کہ مذہب پرستش و پوجا پاٹ کی حد تک رہے تو بالکل درست لیکن اگر ان کے معاملات میں دخل دینے لگ جائے تو غلط اور ناقابلِ برداشت ہے اور قبول نہیں ہے۔ یہی ہے وہ اعتراض جو قومِ مدین نے کیا کہ:

قَالُوا يَا شُعَيْبُ أَصَلَاتُكَ تَأْمُرُكَ أَن نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا أَوْ أَن نَّفْعَلَ فِي أَمْوَالِنَا مَا نَشَاءُ إِنَّكَ لَأَنتَ الْحَلِيمُ الرَّشِيدُ○ (۱۱/۸۷)۔

اُنہوں نے حضرت شعیب علیہ السلام سے کہا کیا تیری صلوٰۃ تجھ سے یہ کہتی ہے کہ ہم اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے اسلاف کرتے چلے آئے ہیں اور یہ کہ نہ ہم جس طرح

ہمارا جی چاہے اموال حاصل کریں اور نہ ہی جس طرح جی چاہے اسے خرچ کریں؟ کیا غریبوں کی ہمدردی اور غمخواری سب تمہارے حصہ میں آ گئی ہے؟ ''مال'' کے لفظ کو خاص طور پر سامنے رکھئے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ نظامِ الصلوٰۃ صرف مساجد کی چار دیواری تک محدود نہیں۔ اس کا دائرہ معاشیات کو بھی اپنے اندر لے آتا ہے۔ قرآن کریم میں ۳۷ مقامات پر صلوٰۃ و زکوٰۃ کا ذکر یکجا آیا ہے اس لئے یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ اللہ کا ارشاد ہے کہ: اَلَّذِیْنَ لَا یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ بِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ کٰفِرُوْنَ o (۴۱/۷)۔ نظامِ زکوٰۃ کا اہتمام نہ کرنے والے حیاتِ اُخروی سے انکار کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دینِ خداوندی ان ناہمواریوں کو دور کرنے کے لئے آتا ہے، جو تقسیمِ رزق کے بارے میں انسانوں نے اپنے خود ساختہ آئین و قوانین کی رو سے پیدا کر رکھی ہیں اور یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر غیر خدائی نظام (دین)، نظامِ خداوندی (الدین) کے مقابلہ میں آتا ہے اور اس سے بڑی شدت سے متصادم ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر تم اپنی صلوٰۃ کا دائرہ اپنی مساجد تک رکھو تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ اعتراض تو ایک طرف میں تمہاری مساجد کی تعمیر، مرمت، روشنی، جھاڑ فانوس، فرش، قالین تک کے لئے مدد دوں گا لیکن اگر تم یہ کہو کہ خدا کا قانون ہماری اقتصادی، معاشی و معاشرتی زندگی کو بھی محیط ہے تو اس کی ہم اجازت نہیں دے سکتے۔

اسلام مذہب نہیں، الدین ہے

مذہب بندے اور اللہ کے درمیان جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے، بزعمِ باطل خود وضع کردہ پرائیویٹ تعلق کا نام ہے اس سے مقصد پرستش یا پوجا پاٹ کے ذریعے جذبات اور ذہنی و قلبی تسکین کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اس کے برعکس الدین اللہ کا عطا کردہ اجتماعی نظامِ زندگی ہے جو قرآن کریم میں دیئے گئے قوانین کے مطابق قائم کیا جاتا ہے اور معاشرہ میں زندگی کے ہر شعبے کو محیط ہوتا ہے یعنی اس میں پرسنل لاء اور پبلک لاء الگ الگ نہیں ہوتے اور نہ ہی اس میں مختلف فرقے و مذاہب ہوتے ہیں اور نہ الگ الگ مسجدیں کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ نہ شیعہ تھے نہ سنی۔ نہ بریلوی یا دیوبندی۔ نہ وہابی یا اہلِ حدیث اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں نہ کوئی مولوی تھا نہ مدرسہ۔ نہ کوئی پیر تھا نہ خانقاہ یا درگاہ و دربار۔ ہر شخص اپنے آپ کو بغیر کسی اضافی نسبت صرف مسلمان کہلاتا تھا لیکن جب رسول کریم ﷺ کے آخری خلیفہؓ کے بعد کونوں کھدروں میں چھپی ہوئی شکست خوردہ قوتوں نے باہر نکل کر اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لئے مسلمانوں کا لبادہ اوڑھا اور معاشرہ میں گھل مل گئے تو انہوں نے مسلمانوں کے ہاتھ سے الدین کا دامن چھڑوا کر انہیں مذہب کی پٹڑی پر ڈالنے کی خاطر وہ تمام غیر قرآنی تصورات و عناصر جنہیں حضور نبی کریم ﷺ نے مٹا کر اس لعنت سے قوم کو آزادی دلائی تھی (۱۵۷/۷) ایک ایک کر کے اسلام کے جزو بنا دیئے۔ مثلاً

(۱) رومن کا فرعونی استبدادِ ملوکیت و نظامِ سیاست مثلاً (آمریت۔ شہنشاہیت۔ جمہوریت وغیرہ) انسانوں پر انسانوں کے خود ساختہ قوانین کا اقتدارِ حکومت کسی بھی شکل میں ہو جس سے قوم مختلف پارٹیوں میں بٹ کر اتنی کمزور ہو جائے کہ کوئی شخص برسرِ اقتدار ہستیوں کے آگے سر اٹھا کر بات تک نہ کر سکے اور یہ

اپنی من مانی کرتے رہیں)۔

(۲) ایرانیوں کی نسل پرستی اور قلبی سکون کے لئے پرستش و پوجا پاٹ۔ (ایک مسلمان کپڑوں پر خوشبو مَل کر اپنے گھر کے ایک کونے میں وِرد و وظائف میں مشغول ہے اور اس کے پڑوس میں موتی لال ماتھے پر تلک لگا کر اپنے گھر میں پوجا کرتا ہے تو دونوں کی زندگی میں کیا فرق رہ جاتا ہے؟ جبکہ وہ دونوں ایک ہی نظام مثلاً آمریت یا مغربی جمہوریت یعنی سیکولرازم کے تابع زندگی بسر کرتے ہوں)۔

(۳) یہودیوں کی مذہبی پیشوائیت اور روایت پرستی (اپنی خود وضع کردہ کہانیوں اور قصوں کو وحی غیر متلو یا وحی خفی کا نام دے کر حضورﷺ کے نام منسوب کرنا حالانکہ حضورﷺ نے اس سے محتاط رہنے کا فرمایا تھا۔ ایک حدیث میں آپﷺ کا قول ہے کہ: ان بنی اسرائیل لما قصوا ھلکوا۔ بنی اسرائیل جب قصہ گوئی میں پڑ گئے تو ہلاک ہو گئے (یعنی وہ ذلیل وخوار ہو گئے اور ان پر زوال کا عذاب چھا گیا)۔

(۴) عیسائیوں اور مجوسیوں کا مسلکِ خانقاہیت (اللہ تعالیٰ نے سورۃ توبہ کی آیت ۳۴ میں جماعتِ مومنین کو احبار و رہبان (اہلِ شریعت و اہلِ طریقت۔ علماء مشائخ) کے باطل طریق سے لوگوں کا مال کھانے کی روش سے آگاہ کیا تھا)۔ ''ربائی' پوپ۔ ان کے اتباع میں مولوی اور پیر کے جبہ وعمامہ میں کوئی فرق نہیں''۔ ان شکست خوردہ عناصر کی مندرجہ بالا سازشوں' سکیموں اور کوششوں کی بدولت ہماری موجودہ روش کا نام مروجہ ''مذہبِ اسلام'' ہے یہ الدین ہرگز نہیں اور قرآن کریم کی تلاوت سے مقصد تھا اس کتابِ عظیم کو سمجھنے کے لئے پڑھنا اور سمجھ کر اس کا اتباع کرنا لیکن مذہبی نقطہ نظر سے محض ایصالِ ثواب قرار پا گیا۔

بروز ہفتہ ۷ جون ۲۰۰۸ء دوپہر کو جیو ٹی وی چینل پر الف پروگرام کے پلیٹ فارم میں مذہبِ اسلام اور دیگر مذاہب میں تقابل کے سلسلہ میں چار پاکستانی مسلم دانشور حضرات آپس میں بڑی گرما گرم بحث میں مشغول دکھائی دیئے۔ ان میں سے ایک نے سورۃ الکفرون کی آیت **لکم دینکم ولی دین** پڑھ کر کہا کہ آپﷺ نے فرمایا تمہارا دین تمہارے لئے اور میرا دین میرے لئے۔ ترجمہ کی حد تک تو کچھ ٹھیک ہے لیکن افسوس! حیرت تو اس بات پر ہوئی کہ بحث چل رہی ہے مختلف مذاہب پر اور درمیان میں ایک شخص آیت پڑھ رہا ہے دین یعنی نظامِ زندگی کے متعلق۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہمارے ہاں دین سے مطلب مذہب ہی لیا جاتا ہے۔ آیت کا مفہوم تو یہ ہے کہ تمہارا نظامِ زندگی تمہارے لئے اور میرا نظامِ زندگی میرے لئے۔ یعنی تم اپنے نظام زندگی پر عمل پیرا رہو۔ مجھے میرے نظامِ زندگی پر چلنے دو نتائج خود بخود بتا دیں گے کہ آخر الامر کامیابی کس کے حصے میں آتی ہے۔ فتح مکہ پر نتائج کھل کر سامنے آ گئے جب حضورﷺ اور آپﷺ کے رفقاءؓ کامیاب ہوئے۔

لفظِ دین کے بہت سے معانی ہیں ان میں سے ایک نظامِ زندگی (اجتماعی نظامِ زندگی) ہے اور دوسرے ٹھوس نتائج۔ دین کا ترجمہ مذہب یا Religion صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ اسلام الدین ہے یعنی اسلامی اجتماعی نظام زندگی ہے' مذہب نہیں۔ چونکہ ہماری زندگی مذہبی ہے اس لئے اکثریت کو الدین کی خبر نہیں۔ مذہب میں کسی عمل کا نتیجہ اس دنیا میں برآمد ہی نہیں

ہوتا۔ پرستش یعنی وِرد و وظائف۔ تسبیح و مناجات کو تو چھوڑ یئے ملاں نے تو نماز و روزہ کی نیکیوں وثواب کا حصول یومِ آخرت پر اٹھا رکھا ہے یہی وجہ ہے کہ ملاں دعاء بھی قبر سے شروع کرتا ہے۔ خود دوسروں کی محنت کی کمائی پرتن آسودگی اور عیش کی زندگی بسر کرتا ہے اور چندہ دینے والے عوام کے لئے اس دنیا کو مُردار گردانتا ہے اور اس کے چاہنے والوں کو کتے۔ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ نے فرما رکھا ہے کہ مومنین کی دعا ہے:

رَبَّنَا آتِنَا فِیُ الدُّنُیَا حَسَنَةً وَفِیُ الآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (۲/۲۰۱)۔

آیت کریمہ میں اس دنیا اور اُخروی دنیا دونوں میں حسنات اور آگ کے عذاب کا ذکر ہے۔ ہمیں صرف اُخروی دنیا کے عذابِ نار کی سٹوری سنائی جاتی ہے قیامتِ موجود کے جس عذابِ نار میں ہم مبتلا ہیں اپنی چکنی چپڑی باتوں سے اس کا احساس ہی مفقود کرا دیا گیا ہے۔ یہی تو اللہ نے فرمایا ہے کہ:

أَفَبِهَذَا الُحَدِیُثِ أَنتُم مُّدُهِنُونَ ٥ وَتَجُعَلُونَ رِزُقَكُمُ أَنَّكُمُ تُكَذِّبُونَ ٥ (۵۶/۸۱-۸۲)۔

کیا تم اپنے خود ساختہ خیالات کو اس کتاب کی طرف منسوب کر کے لوگوں کو صحیح مقام سے پھسلانا چاہتے ہو؟ اور یہ سب اس لئے کرتے ہو کہ تمہاری روٹی کا سامان بہم پہنچتا رہے۔ تم اس کی تکذیب کو اپنے لئے ذریعہ معاش بناتے ہو۔ (کتنی بری ہے یہ روش اور کتنا پست ہے وہ مقصد جس کے لئے تم یہ سب کرتے ہو)۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

(سورہ شعراء کے بعد سورۃ النمل بھی چھپ کر تیار ہو چکی ہے جس کا دیباچہ تعارف کے طور پر قارئینِ طلوع اسلام کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ مژدہ ہو کہ سورۃ النمل کے بعد سورہ قصص کے دروس پر مشتمل جلد بھی پریس میں ہے اور امید ہے کہ 20 جولائی تک دستیاب ہو گی۔ ادارہ۔)

قارئین کرام یقیناً اس حقیقت سے واقف ہوں گے کہ بزم طلوع اسلام کی جانب سے علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دروس قرآن پر مبنی ''مطالب القرآن فی دروس القرآن'' کے نام پر اب تک تیرہ جلدیں شائع ہو چکی ہیں جب کہ اس وقت سورۃ الشعراء کے بعد اسی سلسلہ کی چودھویں جلد یعنی ''سورۃ النمل'' جو 280 صفحات پر مشتمل ہے صاحبان علم و عرفان کے ذوق مطالعہ کی نذر کی جا رہی ہے۔

سورۃ النمل میں حضرت سلیمانؑ اور ملکہ سباء کے حوالے سے تمام گوشے کچھ اس طرح نکھار کر اور ابھار کر بالوضاحت پیش کئے گئے ہیں کہ جن کی بنا پر دلائل و براہین کے تحت سمجھنے اور جاننے میں کسی قسم کا کوئی الجھاؤ باقی نہیں رہتا۔ مزید برآں انہی دروس کے دوران محترم پرویزؒ صاحب نے ہمارے ہاں صدیوں سے مروجہ تفاسیر میں بیان کردہ مختلف تصورات کا بھی تفصیلی طور پر ذکر کیا ہے۔ جس کے تقابلی جائزے سے یہ حقیقت مزید نکھر کر قارئین کے سامنے آ سکے گی کہ ہماری موجودہ سوچ قرآن کریم کی پیش کردہ حقیقی تعلیم اور اس کے دینی تصورات سے کس قدر دوری اختیار کر چکی ہے اور فہرست مشمولات میں دیئے گئے 280 عنوانات سے ہی اس امر کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکے گا۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ سورۃ النمل کے چھٹے درس کے متعلق محترم پرویزؒ صاحب کا کہنا یہ ہے کہ 25 سال کے طویل عرصہ میں دیئے جانے والے دروس قرآن میں سے یہ درس اپنی نوعیت کا پہلا درس ہے جس سے یہ حقیقت واضح ہو سکے گی کہ قرآنی حقائق علی وجہ البصیرت سمجھنے کا طریق کیا ہے۔

برادرانِ عزیز! جیسا کہ آپ جانتے ہیں قرآنِ حکیم نے اپنی تمام تر تعلیم کو جن بنیادی اور محکم ستونوں پر کھڑا کر رکھا ہے وہ اس قدر اہم ہیں کہ اگر کسی مقام پر ان میں سے کسی ایک ستون کو بھی نظر انداز کر دیا جائے تو قرآنِ حکیم کی تعلیم و حکمت کی پوری عمارت ڈھیر ہو کر رہ جاتی ہے۔

قرآنِ حکیم کی تعلیم کے تین بنیادی ستون

1- **قرآنِ حکیم کا کوئی گوشہ مافوق الفطرت نہیں۔** اسی لئے تو قرآنِ حکیم کے پیش کردہ دین کو دینِ فطرت کہا جاتا ہے۔

2- **قرآنِ حکیم میں کوئی بات ایسی نہیں جو مافوق العقل ہو۔** اسی لئے قرآنِ حکیم نے قدم قدم پر عقل و فکر کی اہمیت پر زور دیا ہے۔

3- **قرآنِ حکیم کا کوئی حکم، کوئی نظریہ، کوئی عمل ایسا نہیں جو مافوق البشر ہو۔** جس پر انسان عمل پیرا ہی نہ ہو سکے یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم کا

پیش کردہ نظامِ حیات پوری نوعِ انسانی کے لئے ایک ضابطۂ حیات ہے۔

عزیزانِ من! کاش! ہم نے قرآنِ حکیم کو قرآنِ حکیم کی روشنی میں سمجھنے اور سمجھانے کے لئے مندرجہ بالا ان تین بنیادی نکات کو پیش نظر رکھا ہوتا تو آج ہم صدیوں سے مختلف قسم کی توہم پرستیوں اور باہمی فرقہ بندیوں کی اندھیری غار میں زندگی بسر نہ کر رہے ہوتے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہزار سال سے ملت اسلامیہ اپنے لہولہان پاؤں کے ساتھ خود ساختہ مذہب کے نوکیلے پتھروں پر محوِ سفر ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ دل و دماغ کو صرف قندیلِ آسمانی ہی روشن کر سکتی ہے لہٰذا ہمیں یہ باور کر لینا چاہئے کہ دل کی آرزو کا رنگ بدلے بغیر باہر کی دنیا کا رنگ بدل ہی نہیں سکتا۔ برادرانِ عزیز! یاد رکھئے کہ قوموں میں صلاحیتوں کی ایک چنگاری بھی انہیں زندگی کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کر سکتی ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں پرویزؒ صاحب کا کہنا یہ ہے کہ:

''اگر صلاحیت باقی ہے پھر بھی کچھ توقع باقی ہوتی ہے' کچھ امید باقی ہوتی ہے کہ پانی میں ڈوبا ہوا ہے' سر باہر نکال لے گا' تو سن لے گا۔ ایک دفعہ صحیح بات سن تو لے گا' پھر آگے وہ فیصلہ بھی کر سکتا ہے کہ مجھے ماننا چاہئے یا نہیں ماننا چاہئے۔ جو سننا ہی نہ چاہے تو اس کو کیا کچھ سنائے گا! اس لئے قرآن کریم نے کہا کہ: وَمَا أَنتَ بِهَادِي الْعُمْيِ عَن ضَلَالَتِهِمْ إِن تُسْمِعُ إِلَّا مَن يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا فَهُم مُّسْلِمُونَ (27:81)۔ اندھے کو تو راستہ نہیں دکھا سکتا' بہرے کو تو بات نہیں سنا سکتا۔ یہ تو اسی کو سنائے گا جو اس چیز کے اوپر آمادہ ہو کہ میں سنوں' غور و فکر کے بعد دیکھوں کہ یہ صحیح ہے۔ صحیح پائے تو اس کو قبول کر لے' اور اس کو قبول کرنے کے بعد اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے۔ یہ جو کرے گا اس کو یہ قرآن فائدہ دے گا ورنہ یہ مردوں کی بستی کے اندر مرثیے پڑھ کر تم چلے آؤ۔ کچھ کر لو' فاتحہ پڑھنے کے بعد وہ تو زندہ نہیں ہو سکتے۔'' (بحوالہ درسِ قرآنِ حکیم' مورخہ 3 نومبر 1978ء)۔

پرویزؒ صاحب کی زندگی بھر کی خواہش

عزیزانِ من! آخر پر مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ محترم پرویزؒ صاحب کے دل کی دھڑکن کی یہی وہ آواز تھی جسے ہم سن نہ سکے۔ چنانچہ مفکرِ قرآن نے اسی حساس خیالی کے پیشِ نظر 22 دسمبر 1978ء کو ایک درس کے دوران فرمایا کہ:

''میرے عزیزو! زندگی کے اس مرحلے میں کیا کروں؟ **کہیں مجھے نوجوان مل جاتے تو انہیں میں نصاب کے طور پر قرآن پڑھاتا اور انہیں اقبال سناتا۔**''

افسوس کہ ان کی یہ دلی خواہش پوری نہ ہو سکی اور بقول غالب کہ

غم سے مرتا ہوں کہ دنیا میں نہیں ہے کوئی
کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد

اشرف ظفر
نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام لاہور
10-06-2008

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آصف جلیل، کراچی
asif.jalil1@gmail.com

حضرت انسان قرآن کے آئینے میں

(قسط۲)

وَ لَنْ تَرْضٰی عَنْکَ الْیَھُوْدُ وَ لَا النَّصٰرٰی حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَھُمْ قُلْ اِنَّ ھُدَی اللّٰہِ ھُوَ الْھُدٰی وَ لَئِنِ اتَّبَعْتَ اَھْوَآءَ ھُمْ بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَ کَ مِنَ الْعِلْمِ مَالَکَ مِنَ اللّٰہِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیْرٍ (2:120)۔

آپ سے یہود و نصاریٰ ہرگز راضی نہیں ہوں گے جب تک کہ آپ ان کے مذہب کے تابع نہ بن جائیں، آپ کہہ دیجئے کہ اللہ کی ہدایت آ جانے کے بعد، پھر ان کی خواہشوں کی پیروی کی تو اللہ کے پاس آپ کا نہ تو کوئی ولی ہوگا اور نہ کوئی مددگار۔

یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ اگر یہود و نصاریٰ کا ذکر ان آیات میں آیا ہے تو یہ سمجھنا صحیح نہیں ہوگا کہ ان کا اطلاق دوسرے لوگوں پر نہیں ہوگا۔ آج جتنے مذاہب یا اسلام کے نام پر فرقے ہیں وہ بھی اسی طرح کی ذہنیت رکھتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی ہدایت بالکل واضح ہے کہ اتباع صرف اللہ تعالیٰ کے قوانین کا ہونا چاہئے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَالْھُدٰی مِنْ م بَعْدِ مَا بَیَّنّٰہُ لِلنَّاسِ فِی الْکِتٰبِ اُولٰٓئِکَ یَلْعَنُھُمُ اللّٰہُ وَ یَلْعَنُھُمُ اللّٰعِنُوْنَ (2:159)۔

جو لوگ ہماری اتاری ہوئی دلیلوں اور ہدایت کو چھپاتے ہیں باوجودیکہ ہم اسے اپنی کتاب میں لوگوں کے لئے بیان کر چکے ہیں، ان لوگوں پر اللہ کی اور تمام لعنت کرنے والوں کی لعنت ہے۔

یہاں ایک جرم کی نشاندہی کی گئی ہے جس کا ارتکاب عام ہے۔ وہ یہ کہ اللہ کی ہدایت جو اس کی کتاب میں ہے اسے چھپایا جائے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت کا ذکر بھی کسی منبر سے نہیں ہوتا۔ اللہ کی ہدایت کو چھپانے کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ باتیں عام کی جائیں جو کتاب اللہ میں نہیں ہیں۔

لعنت کا صحیح مفہوم ہے محروم ہو جانا۔ قرآن کریم میں انسانوں کی بھلائی اور منفعت کی باتیں ہیں جن سے

آگاہ نہ ہونا یا جانتے ہوئے نظر انداز کرنے سے انسان ان کی افادیت سے محروم ہو جاتا ہے۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ وَ لَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا وَّ اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ (2:165)۔

بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ کے شریک اوروں کو ٹھہرا کر ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی محبت اللہ سے ہونی چاہئے اور ایمان والے اللہ کی محبت میں بہت سخت ہوتے ہیں۔ کاش کہ مشرک لوگ جانتے جب کہ اللہ کے عذاب کو دیکھ کر کہ تمام طاقت اللہ ہی کو ہے اور اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے۔

اس سوچ کا مظاہرہ ہمارے معاشرے میں بہت ہی عام ہے۔ مشکل کشا' گنج بخش وغیرہ کے القاب سے شخصیات سے عقیدت کے نام سے معاشرے میں بہت سی ایسی رسوم رائج ہو چکی ہیں جن کا اسلام سے دور تک تعلق نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کا ذکر کرنے کے بعد ہم سے کہا ہے کہ وہ ایک امت تھی جو گزر گئی۔ ان کے اعمال ان کے ساتھ اور تمہارے اعمال تمہارے ساتھ۔ تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ وہ کیا کرتے تھے۔ جب انبیاء کرامؑ کے بارے میں یہ بات کہی گئی ہے تو پھر دوسری شخصیات کا ذکر ہی کیا وہ تو انبیاء کرامؑ سے بڑھ کر نہیں ہو سکتیں۔ اس آیات کی خلاف ورزی کے نتیجہ میں بے شمار خاندان پیروں اور خانقاہوں کی وجہ سے تباہ ہو چکے ہیں۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّ لَا يَهْتَدُوْنَ (2:170)۔

اور ان سے جب بھی کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی کتاب کی تابعداری کرو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اس طریقے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا' گو ان کے باپ دادے بے عقل اور گم کردہ راہ ہوں۔

یہ ایک بہت ہی بڑی نفسیاتی روکاوٹ ہے جو کسی بات کو منوانے کی راہ میں حائل ہوتی ہے کہ انسان اس روش کے خلاف نہیں جانا چاہتا جو معاشرے میں رائج ہو یا جسے اس نے اپنے باپ دادا سے سیکھا ہو۔ اسی کمزوری کو بنیاد بنا کر مذہبی پیشوا لوگوں کے جذبات کو استعمال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ فلاں شخص کیا آپ کے بزرگوں سے زیادہ قرآن سمجھتا ہے؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات بھی کہی ہے کہ تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ گزرے ہوئے لوگوں نے کیا کیا۔ ہم سے صرف ہمارے اعمال کے بارے میں پوچھا

جائے گا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنَ الْکِتٰبِ وَ یَشْتَرُوْنَ بِہٖ ثَمَنًا قَلِیْلاً اُولٰٓئِکَ مَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِھِمْ اِلَّا النَّارَ وَ لَا یُکَلِّمُھُمُ اللّٰہُ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَ لَا یُزَکِّیْھِمْ وَ لَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْم (2:174)۔

بے شک جو لوگ اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی کتاب چھپاتے ہیں اور اسے تھوڑی تھوڑی سی قیمت پر بیچتے ہیں' یقین مانو کہ یہ اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں' قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان سے بات بھی نہ کرے گا' نہ انہیں پاک کرے گا بلکہ ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

یہاں پھر اللہ کی کتاب میں آئی ہوئی باتوں کو چھپانے کے بارے میں ذکر آیا ہے۔ اس کے ساتھ ان آیات کو سستے داموں بیچنے کا ذکر آیا ہے۔ اس میں ہمارے مذہبی پیشواؤں کی صحیح طور پر عکاسی کی گئی ہے جو مذہب کو ذریعہ معاش بنائے ہوئے ہیں' بلکہ اب تو وہ چندے کے پیسوں سے پُرتعیش زندگی بسر کر رہے ہیں۔ وہ قرآن کریم کے بہت سے عظیم حقائق کو منظر عام پر نہیں لاتے اس لئے کہ وہ ان عطیات سے محروم ہو سکتے ہیں جو وہ غیر قرآنی عقائد کی وجہ سے حاصل کرتے ہیں' مثال کے طور پر مُردوں کے لئے فاتحہ خوانی' ختم وغیرہ۔ ایسے لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے دردناک عذاب مقرر کیا ہے۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یُّعْجِبُکَ قَوْلُہٗ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَ یُشْھِدُ اللّٰہَ عَلٰی مَا فِیْ قَلْبِہٖ وَ ھُوَ اَلَدُّ الْخِصَام وَ اِذَا تَوَلّٰی سَعٰی فِی الْاَرْضِ لِیُفْسِدَ فِیْھَا وَ یُھْلِکَ الْحَرْثَ وَ النَّسْلَ وَ اللّٰہُ لَا یُحِبُّ الْفَسَادَ وَ اِذَا قِیْلَ لَہُ اتَّقِ اللّٰہَ اَخَذَتْہُ الْعِزَّۃُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُہٗ جَھَنَّمُ وَ لَبِئْسَ الْمِھَادُ (2:203-206)۔

بعض لوگوں کی دنیاوی غرض کی باتیں آپ کو خوش کر دیتی ہیں اور وہ اپنے دل کی باتوں پر اللہ کو گواہ کرتا ہے' حالانکہ دراصل وہ زبردست جھگڑالو ہے۔ جب وہ لوٹ کر جاتا ہے تو زمین میں فساد پھیلانے کی اور کھیتی اور نسل کی بربادی کی کوشش میں لگا رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ فساد کو ناپسند کرتا ہے۔ اور جب اس سے کہا جائے کہ اللہ سے ڈر تو تکبر اور تعصب اسے گناہ پر آمادہ کر دیتا ہے' ایسے کے لئے بس جہنم ہی ہے اور یقیناً وہ بدترین جگہ ہے۔

یہاں پر انسان کی ایک اور تصویر دکھائی گئی ہے جس میں کچھ لوگ بظاہر بڑے پارسا اور نیکوکار دکھائی دیتے ہیں۔ اپنی خوشنما باتوں سے انسانوں کو گرویدہ بنا لیتے ہیں اور بات بات پر اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں لیکن وہ ایسے کام کرتے ہیں

جن سے زمین پر فساد برپا ہوتا ہے اور ذرائع پیداوار اور انسانی جانیں تباہ ہوتی ہیں۔ تکبر اور انا پرستی کی وجہ سے وہ غلط کاریوں میں مبتلا رہتے ہیں اور کسی کی نصیحت پر کان نہیں دھرتے۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَ الْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَ الْفِضَّةِ وَ الْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَ الْاَنْعَامِ وَ الْحَرْثِ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ اللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ (3:14-)۔

مرغوب چیزوں کی محبت لوگوں کے لئے مزین کردی گئی ہے' جیسے عورتیں اور بیٹے اور سونے اور چاندی کے جمع کئے خزانے اور نشاندار گھوڑے اور چوپائے اور کھیتی' یہ دنیا کی زندگی کا سامان ہے اور لوٹنے کا اچھا ٹھکانا تو اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے۔

اس آیت میں لوگوں کی کچھ خواہشات کے بارے میں بتایا گیا ہے جنہیں مقصود زندگی بنا لیا جاتا ہے اور ان کے لیے قرآنی اقدار کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے۔ ہم اگر اپنے ملک میں رہنے والوں کا حال دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ کس طرح لوگ حلال وحرام کی تمیز کے بغیر زندگی کی آسائشیں حاصل کرنے میں لگے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ رہبانیت اختیار کرلیں لیکن یہ بھی ٹھیک نہیں کہ ان سب کے حصول کی خاطر اللہ تعالیٰ کے احکامات کی خلاف ورزی کی جائے۔ مقصد یہ ہے کہ حال کی خوشحالی اگر مستقبل کی بدحالی کا باعث ہو تو ایسی وقتی اور عارضی آسائشوں کا کیا فائدہ۔ آج کل اگر اس آیت کی چلتی پھرتی تصویریں دیکھنی ہوں تو ان لوگوں کو دیکھیں جن کے گھروں میں بہت سا سامان اور نئی گاڑی' سب قسطوں پر ہیں اور جب بنک والے تقاضہ کرنا شروع کردیتے ہیں تو ان کا حال کیا ہوتا ہے۔

وَ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَ اكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ o وَ لَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (3:72-73)۔

اور اہل کتاب کی ایک جماعت نے کہا کہ جو کچھ ایمان والوں پر اتارا گیا ہے اس پر دن چڑھے تو ایمان لاؤ اور شام کے وقت کافر بن جاؤ تاکہ یہ لوگ بھی پلٹ جائیں۔ اور سوائے تمہارے دین پر چلنے والوں کے اور کسی کا یقین نہ کرو۔ آپ کہہ دیجئے کہ بے شک ہدایت تو اللہ ہی کی ہدایت ہے۔ (اور یہ بھی کہتے ہیں کہ اس بات کا بھی یقین نہ

کرو) کہ کوئی اس جیسا دیا جائے جیسا تم دیئے گئے ہو' یا یہ کہ یہ تم سے تمہارے رب کے پاس جھگڑا کریں گے' آپ کہہ دیجئے کہ فضل تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے' وہ جسے چاہے اسے دے' اللہ تعالیٰ وسعت والا اور جاننے والا ہے۔

یہودیوں کی روش کا اطلاق آج کل ہمارے ہاں پائے جانے والے مختلف فرقوں پر ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر کوئی یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ راہ راست پر ہے اور دوسرے سب غلط ہیں۔ وہ اپنے پیروکاروں کو یہی ہدایت کرتے ہیں کہ صرف اپنے مسلک کو صحیح جانو۔ بظاہر یہ دوسروں کی ہاں میں ہاں بھی ملا دیتے ہیں لیکن دل سے اسے تسلیم نہیں کرتے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے تو صحیح اور غلط کام کا معیار اپنی ہدایت کو قرار دیا ہے جو صرف قرآن کریم میں ہے۔

وَمِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ إِن تَأْمَنْهُ بِقِنطَارٍ يُؤَدِّهِ إِلَيْكَ وَمِنْهُم مَّنْ إِن تَأْمَنْهُ بِدِينَارٍ لَّا يُؤَدِّهِ إِلَيْكَ إِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِماً ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُواْ لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ وَيَقُولُونَ عَلَى اللّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ (3:75)

بعض اہل کتاب تو ایسے ہیں کہ اگر انہیں تو خزانے کا امین بنا دے تو بھی وہ تجھے واپس کر دیں اور ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں کہ اگر تو انہیں ایک دینار بھی امانت دے تو تجھے ادا نہ کریں۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ تو اس کے سر پر ہی کھڑا رہے، یہ اس لئے کہ انہوں نے کہہ رکھا ہے ہم پر ان جاہلوں کے حق کا کوئی گناہ نہیں' یہ لوگ باوجود جاننے کے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ کہتے ہیں۔

یہ اہل کتاب کی دیانت داری کے بارے میں ہے۔ کیا آج مسلمانوں کی حالت اس سے بھی خراب نہیں ہے؟ ہم سب ایک دوسرے پر کس قدر اعتماد کرتے ہیں؟ دوسری بات یہ کہی گئی ہے کہ یہ دوہرا معیار اختیار کرتے ہیں۔ اور ایک نہایت اہم بات کا تذکرہ بھی ہے کہ اللہ کے بارے میں جانتے ہوئے بھی جھوٹی باتیں کہتے ہیں۔ کیا ہم نے کبھی غور کیا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ سے کتنی باتیں منسوب کرتے ہیں جو قرآن کریم میں نہیں ہیں۔

وَ اِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَ مَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ وَ يَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَ مَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَ يَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ (3:78)۔

یقیناً ان میں ایسا گروہ بھی ہے جو کتاب پڑھتے ہوئے اپنی زبان مروڑتا ہے تاکہ تم اسے کتاب ہی کی عبارت خیال کرو حالانکہ دراصل وہ کتاب میں سے نہیں' اور یہ کہتے بھی ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی

طرف سے ہے حالانکہ دراصل وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں، وہ تو دانستہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولتے ہیں۔

کیا یہی سب کچھ ہمارے مذہبی پیشوا نہیں کرتے؟ کتنی ہی باتیں اسلام کے نام پر پیش کی جاتی ہیں لیکن ان کا ذکر قرآن کریم میں نہیں ملتا۔ اللہ تعالیٰ اپنے سوا کسی کی بات کو الحق تسلیم نہیں کرتا اور اللہ کی بات تو صرف قرآن کریم ہی سے ملتی ہے۔ یہاں پھر وہی بات کہی گئی ہے کہ تم جاننے کے باوجود اللہ کے بارے میں جھوٹ بولتے ہو۔ یہ بات ذہن نشین کرنے والی ہے کہ نبی کریم ﷺ پر قرآن کریم نازل ہوا ہے اور ان کا عمل بھی اس کے مطابق تھا۔ لہٰذا ان سے کوئی ایسی بات منسوب کرنا صحیح نہیں ہوگا جو قرآن کریم کے خلاف ہو۔ یہ سمجھنا اس لیے ضروری ہے کہ حضور ﷺ کے نام کا سہارا لے کر بھی بہت سی غیر قرآنی باتیں پھیلائی گئی ہیں۔

(جاری ہے)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقطۂ نظر

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی

زکوٰۃ کی ادائیگی کا مسئلہ

میرے ایک محترم عزیز جو بہت بڑے انڈسٹریلیسٹ (Industrialist) اور تاجر ہیں، اور اللہ و رسول کی اطاعت کے دل سے پابند ہونے کی وجہ سے زکوٰۃ کی خطیر رقم ادا کرتے رہتے ہیں، انہوں نے زکوٰۃ کی ادائیگی کے سلسلہ میں چند سوالات کئے ہیں۔ موجودہ دور میں زکوٰۃ کس کو دیں تاکہ حکمِ خداوندی کی تعمیل ہو جائے۔ یہ سوال چونکہ اکثر حضرات کو پریشاں کئے ہوئے ہے، اس سلسلہ میں چند گذارشات پیشِ خدمت عالی کی جاتی ہیں۔

صلوٰۃ و زکوٰۃ اسلامی نظام کی دو بنیادی اصطلاحیں ہیں اور آپس میں اس درجہ مربوط اور لازم و ملزوم ہیں کہ ان میں سے ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا اور ان دونوں ارکان پر اسلامی نظام کے قائم ہوئے بغیر کسی طرح بھی عمل نہیں کیا جا سکتا چونکہ یہ بیان کردہ بات عام مسلمانوں کے عمل کے خلاف ہے اس لئے ہر شخص اس بات کو سن کر متعجب و حیران ہو جاتا ہے لیکن حقیقت یہی ہے۔ اس بارے میں سورہ حج کی اکتالیسویں آیہ کریمہ حجتِ قاطعہ کا درجہ رکھتی ہے۔ چونکہ یہ مسئلہ اہم ہے، اور قطعاً نامانوس ہے، اسی لئے اس آیہ کریمہ کے مستند تراجم پیش کئے جاتے ہیں تاکہ کسی قسم کا التباس و اشتباہ نہ رہے۔ پہلے آیہ کریمہ ملاحظہ فرمائیں۔ ارشاد ہوتا ہے: إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ (۲۲/۴۱)۔ اب اس آیہ کریمہ کے تراجم ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) قدیم ترین اور مستند ترین ترجمہ جو تحت اللفظ بھی ہے اس میں ارشاد ہے۔

''وہ کہ اگر ہم ان کو مقدور دیں ملک میں، کھڑی کریں نماز اور دیں زکوٰۃ۔'' (ترجمہ شاہ عبدالقادر)۔

(۲) حضرت اقدس جناب شیخ الہند قدس سرہ کا ترجمہ ہے:

''وہ لوگ کہ اگر ہم ان کو قدرت دیں ملک میں تو قائم رکھیں نماز اور دیں زکوٰۃ۔''

(۳) معروف شیعہ ترجمہ مولانا فرمان علی صاحب کا

ہے' اس میں ارشاد ہے:

''یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں روئے زمین پر قابو دیں تو وہ (بھی) یہ لوگ پابندی سے نماز ادا کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے۔''

چونکہ آیت کے ترجمہ سے مسلمانوں کے عمل کی تصویب نہیں ہوتی' اس لئے مترجمین اس ترجمہ میں قوسین میں اپنی طرف سے اضافہ کر رہے ہیں۔ اس ترجمہ میں بھی لفظ بھی اور پابندی مترجم کا ذاتی اضافہ ہے ترجمہ میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ صرف اپنے فکر و نظریہ کی تصویب کی خاطر ان دو لفظوں یعنی بھی اور پابندی کا اضافہ کیا ہے۔ تاہم اس کے باوجود بھی اقتدار کا Pre-requiste ہونا ثابت ہوتا ہے۔

(۴) مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری' مشہور اہل حدیث عالم و معروف مناظر نے ترجمہ کیا ہے:

''یہ ایسے لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو حکومت دیں تو نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں گے۔''

ترجمہ اس درجہ واضح ہے اور اقامتہ صلوٰۃ و ایتائے زکوٰۃ کے لئے حکومت کو اس درجہ شرط قرار دیا ہے کہ مزید کچھ تحریر کرنے کی ضرورت ہی نہیں چھوڑی۔

(۵) مشہور تفسیر ''تدبر قرآن'' میں ارشاد ہے:

''اگر ہم ان کو سرزمین میں اقتدار بخشیں گے تو وہ نماز کا اہتمام کریں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے۔''

خط کشیدہ الفاظ' اگر اور تو' کس طرح اقتدار کو صلوٰۃ و زکوٰۃ کے لئے شرط قرار دے رہے ہیں۔

(۶) انگریزی معروف ترجمہ Pickthall کا ہے۔ اس میں درج ہے:

"Those who, if we give them power in the land, establish worship and pay the poor-due."

(۷) ایران سے طبع شدہ ترجمہ میں ہے:

''آکسانیکہ اگر اقتدار دھیم ایشانرا در زمین برپاد ارند نماز را و بدہند زکوٰۃ را۔''

(۸) حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی نے فتح الرحمٰن میں یہ ترجمہ درج کیا ہے:

''آناں را کہ اگر دست رس دھیم ایشانرا در زمین برپا دارند نماز را و بدہند زکوٰۃ را۔''

(۹) اس کی تفسیر میں ملا واعظ کاشفی تفسیر حسینی میں تحریر فرماتے ہیں:

''اگر جائے دہیم ایشانرا در زمین و دستگاہ و اختیار پابند بپائی دارند نماز را۔ بجیت تعظیم من و بدہند زکوٰۃ مال را بجیت مساعدت بندگان من۔''

(۱۰) تفسیر ابن کثیر میں مرقوم ہے:

''یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم زمین میں ان کے پاؤں جما دیں تو یہ پوری پابندی سے نماز ادا کریں اور

زکوٰۃ دیں۔''

(۱۱) تفسیر جلالین درسی کتاب ہے۔علمائے کرام جب اپنے درس میں قرآنِ کریم کا ترجمہ یا تفسیر کرتے ہیں تو اس سے ہی مدد لیتے ہیں۔اس میں ملاحظہ فرمائیں کہ وہ ترجمہ کے علاوہ کس طرح وضاحت کرتے ہیں کہ اقتدار ان دونوں ارکان کی ادائیگی کے لئے کس درجہ ضروری ہے۔ فرماتے ہیں:

''اگر ہم انہیں دنیا میں حکومت دیں (دشمنوں کے مقابلہ میں ان کی مدد کر کے) تو یہ لوگ نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں۔''

اس کے بعد جو تحریر ہے اس کو بغور ملاحظہ فرمائیں۔ارشاد ہوتا ہے:

''ان مکنا میں جو شرط تھا اقاموا الصلوٰۃ اور اس کے بعد کا جملہ اس شرط کا جواب ہے''۔

یہاں آپ غور فرمائیں کہ جلالین شریف نے بات کس قدر واضح کر دی ہے کہ تمکن فی الارض یعنی اقتدار شرط ہے اور اس شرط کا جواب اقامتہ الصلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ ہے۔ مناطقہ کا مشہور اصول ہے۔اذا فات الشرط فات المشروط۔ اگر شرط پوری نہ ہو تو مشروط ساقط ہو جاتی ہے۔یعنی اگر اقتدار حاصل نہ ہو' تو اقامتہ الصلوٰۃ و ایتاء الزکوٰۃ ممکن نہیں ہے۔

آپ کے سامنے گیارہ مستند ترین اور معتبر ترین تراجم پیش خدمت کئے گئے ہیں۔ یہ تراجم اس درجہ واضح اور حتمی ہیں کہ ہمارے علمائے کرام اس سے سرمو انحراف نہیں کر سکتے۔اس ترجمہ کے آگے وہ اس قدر مجبور ہیں کہ اس سے انکار ان کے بس کی بات نہیں ہے۔

یہاں تک یہ بات واضح ہو گئی کہ جس ملک میں مسلمان مغلوب و محکوم ہیں وہاں وہ زکوٰۃ ادا نہیں کر سکتے۔ انگلینڈ' یورپ' امریکہ کے مسلمان زکوٰۃ ادا نہیں کر سکتے۔ جہاں تک ان ممالک کا تعلق ہے جہاں مسلمان حاکم ہیں اس بارے میں عرض ہے (اگرچہ قرآن کی رو سے تو آزادی کے معنے یہ ہیں کہ اس ملک میں حکومت صرف اللہ تعالیٰ کی ہو)۔

(۱) قرآن کریم نے طاغوت میں زندگی بسر کرنے کو حرام قرار دیا ہے۔يُرِيدُونَ أَن يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَن يَكْفُرُوا بِهِ (۴/۶۰)۔ان کا ارادہ یہ ہے کہ سرکشوں کو اپنا حاکم بنائیں حالانکہ ان کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ اس کا انکار کر دیں۔ اس آیہ کریمہ نے طاغوت کو خود Define کر دیا ہے کہ ہر وہ ملک جس میں فیصلے و حکومت اللہ کے قانون سے سرکش باغی کی ہو اس معاشرہ میں زندگی بسر کرنا حرام ہے۔ اس معاشرہ میں زندگی بسر کرنے والے اللہ سے باغی اور اللہ کے مجرم ہیں (۶/۱۲۳)۔مجرموں' سرکشوں اور خدا کے باغیوں کو زکوٰۃ

دینے سے کیا تعلق۔

(۲) قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ جو قانون خداوندی کے مطابق فیصلے نہ کریں وہ کافر' فاسق و ظالم ہیں۔ (۵/۴۴' ۵/۴۵' ۵/۴۷) ان میں عدالتی و عائلی فیصلوں کے ساتھ ساتھ معاشی فیصلے بھی شامل ہیں۔ اگر کسی ملک کا معاشی نظام' اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ معاشی نظام کے خلاف ہے' تو اس ملک کے رہنے والے ظالم' فاسق و کافر ہیں۔ اس نظام میں زکوٰۃ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

(۳) ہمارے اس دور میں ساری دنیا میں' ہر طرف اور ہر جگہ سودی نظام جاری ہے۔ پاکستان میں بھی ہماری معیشت سود یعنی ربوٰ پر قائم ہے۔ سودی منافع میں سے زکوٰۃ کس طرح ادا کی جاسکتی ہے۔

(۴) قرآن کریم نے ملکیت زمین کو ناجائز قرار دیا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک نہ صرف ملکیت زمین حرام تھی بلکہ اس کی خرید و فروخت بھی حرام تھی۔ بلکہ حدیث میں تو مکابرہ بھی حرام ہے' لیکن امام ابوحنیفہؒ کے شاگردوں امام محمد اور امام ابو یوسف نے' ملوکیت کے زیر اثر ملکیت زمین جائز قرار دے دی۔ چونکہ امام ابو یوسف اپنے دور میں قاضی القضاۃ تھے' اس لئے ان کا فتویٰ ساری مملکت میں جاری ہو گیا۔ ہمارے ہاں پاکستان میں فیوڈل سسٹم جاری ہے۔ جاگیرداری اور زمین داری کی آمدنی ناجائز ہے۔ حرام آمدنی سے زکوٰۃ ادا کرنی جائز نہیں ہے۔

قرآن کریم کی رو سے زکوٰۃ کا نہ تو کوئی نصاب ہے اور نہ ہی اس کے مصارف کا بیان ہے۔ ہمارے علمائے کرام زکوٰۃ کے جو مصارف قرآن کریم میں بیان کردہ بتاتے ہیں وہ زکوٰۃ کے مصارف نہیں ہیں بلکہ وہ صدقات کے مصارف ہیں۔ قرآنِ کریم کے مطابق اسلامی حکومت کے کل Revenues جن کو نوعِ انسانی کی نشوونما کے لئے خرچ کیا جائے زکوٰۃ ہیں' اس نشوونما میں جسمانی اور انسانی زندگی دونوں کی نشوونما شامل ہوتی ہے۔ اس کی وضاحت اس آیہ کریمہ میں کی گئی جبکہ فرمایا: وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ (۲۳/۴)۔ مومنین وہ ہیں جو نوع انسانی کی نشوونما کے لئے کوشش کرتے رہتے ہیں۔ آیہ کریمہ میں دینے یا عطا کرنے کے لئے کوئی لفظ نہیں ہے ہمارے علماء کرام نے بھی اس کا ترجمہ ''اور جو زکوٰۃ کیا کرتے ہیں'' کیا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ زکوٰۃ کوئی صرف Coin میں دینے کی ہی چیز نہیں ہے۔ ہمارے علماء کا یہ تسامح ہے کہ انہوں نے زکوٰۃ کو صرف روپوں اور Coins میں حصر کر دیا ہے۔ ازواج مطہرات کے لئے ارشاد ہے: وَاٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ (۳۳/۳۳)۔ اور (اے ازواج نبی) زکوٰۃ دیا کرو' ظاہر ہے کہ ازواجِ مطہرات کی کوئی مستقل آمدنی نہیں تھی کہ ان پر زکوٰۃ کے موجودہ نصاب کے مطابق زکوٰۃ فرض ہوتی۔ انہیں یہی حکم تھا کہ تعلیم و تربیت کے ذریعے اور جو کچھ علم و تربیت انہیں خود حضورﷺ سے حاصل ہوا' اس کو

بروئے کار لا کر معاشرہ کے افراد کی تربیت ونشوونما کر۔ سورۃ بقرہ میں ارشاد ہوتا ہے: وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّآئِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ (۲/۱۷۷)۔(اصل نیکی اس کی ہے جو) اس کی محبت میں اپنا مال قرابت داروں' یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں اور مانگنے والوں اور غلام آزاد کرانے میں صرف کرے۔ اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے: وَأَقَامَ الصَّلاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ اور پابندی سے نماز پڑھے اور زکوٰۃ دیتا رہے۔ اس سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ ایتائے زکوٰۃ مال و دولت دینے کے علاوہ بھی کچھ ہے اور دوسری بات یہ واضح ہوتی ہے کہ ایتائے زکوٰۃ صرف نظام صلوٰۃ میں ہی ہوسکتی ہے۔

مضمون ختم کرنے سے پیشتر ایک واقعہ محض حکایۃً تحریر کیا جاتا ہے۔ دارلعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث (Recter) شیخ الکل فی الکل' جناب قاری طیب صاحب وقتاً فوقتاً لاہور تشریف لاتے تھے۔ ان کی ذات خود صفات اعلیٰ کی حامل تھی۔ اس کے علاوہ وہ مولانا نانوتوی کے نبیرہ تھے۔ اس وجہ سے لاہور میں ان کا بڑا استقبال ہوتا تھا۔ ہفتہ وار چٹان نے سرورق پر ان کی تصویر شائع کی اور اس تصویر کے نیچے علامہ اقبالؒ کا مشہور مصرعہ تحریر کیا ''قاری نظر آتا ہے' حقیقت میں ہے قرآن''۔ اس سے زیادہ ان کی تعریف ممکن نہیں تھی۔ قاری صاحب کی آمد پر ظاہر ہے کہ ان کی چند تقاریر بھی ہوتی تھیں' ایک تقریر میں قاری صاحب نے فرمایا کہ ہمارے مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کے تین دانت مصنوعی لگے ہوئے تھے۔ ان مصنوعی دانتوں کو' اصلی دانتوں سے پیوستہ کرنے کے لئے Dentist نے ایک سونے کا تار لگایا ہوا تھا۔ اس سونے کے تار کی وجہ سے وہ دانت حضرت کے دہن مبارک میں ٹِکے ہوتے تھے۔ حضرت اقدس اپنی سالانہ آمدنی میں سے زکوٰۃ ادا فرماتے تھے تو دانتوں میں پیوستہ سونے کے اس تار کی زکوٰۃ بھی ادا فرماتے تھے لیکن اس کے باوجود حضرت کو یہ تردد رہتا تھا کہ چونکہ اس تار کا اصل وزن معلوم نہیں تھا۔ ایسا نہ ہو کہ اس تار کی زکوٰۃ پوری ادا نہ ہو رہی ہو۔ تقریر کے دوران قاری طبیب صاحب کے اس بیان پر مولانا تھانوی صاحب کے لئے تعریف وتحسین کی صدائیں بلند ہوئیں اور چند ضعیف العمر حضرات آبدیدہ بھی ہوگئے۔

حضرت تھانوی نے بے شمار کتب تحریر فرمائی ہیں جو بار بار طبع ہوئی ہیں۔ آپ ان ساری کتب کو خوردبین لگا کر مطالعہ فرمائیں' کہیں ایک لفظ طاغوت کے خلاف یا اسلامی نظام کے قیام کی جدوجہد پر نہیں ملے گا۔ اس کو کہتے ہیں اونٹ کو نگل جانا اور مچھر کو چھان چھان کر پینا۔

وآخر دعوانا ان الحمدلله رب العالمين

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(تیسرا باب)

سورۃ الملک

(آیات 7 تا 14)

خوانندگانِ محترم! جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ پرویز صاحب علیہ الرحمہ کے دروسِ قرآن کی تسوید و اشاعت کا سلسلہ تقریباً سات سال سے جاری و ساری ہے۔ اس سلسلے کا سب سے پہلا درس اگست 2000ء میں ماہنامہ طلوع اسلام میں شائع ہوا تھا۔ قارئینِ کرام کی دلچسپی اور حوصلہ افزائی سے یہ دروس گاہے گاہے ماہنامہ طلوع اسلام میں بھی چھپتے رہے اور بعد ازاں کتابی صورت میں بھی مسلسل آپ تک پہنچ رہے ہیں۔ آپ سے ایک بار پھر استدعا کی جاتی ہے کہ آپ ہمیں اس سے متعلق اپنی رائے لکھ کر بھیجئے کہ اس کام کو اسی نہج پر جاری رکھا جائے اور ماہنامہ طلوع اسلام میں بھی شائع کیا جائے۔ آپ کے ذہن میں اگر کوئی تجویز ہو تو وہ بھی ادارہ طلوع اسلام کے پتہ پر لکھ بھیجئے تاکہ آپ کے فیڈ بیک سے ہم استفادہ کر سکیں۔ شکریہ

عزیزانِ من! آج اکتوبر 1983ء کی 14 تاریخ ہے اور درسِ قرآن کریم کا آغاز سورۃ الملک کی آیت 6 سے ہو رہا ہے: (67:6)۔

علمِ نجوم اور قسمت کا تعلق خلافِ قرآن ہے

سابقہ درس میں ایک ہی بات سامنے آئی تھی اور وہ یہ تھی کہ یہ منجم جو علمِ نجوم کی بنا پر لوگوں کی قسمتیں بتاتے ہیں یا جس طریق سے بھی انسان کے مقدر کے متعلق بات کی جاتی ہے' یہ قرآنِ کریم کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے۔ یہ صرف یہی ایک چیز علم نجوم نہیں ہے اس کے دیگر طریق بھی مروج ہیں مثلاً وہ جو یہاں فٹ پاتھ پہ طوطے لیے بیٹھے ہوئے ہیں وہ بھی قسمت کا حال بتاتے ہیں۔ یہ طریقِ کار انسانیت کی تذلیل ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ قرآن نے اسے انتہائی شدید اور ذلیل ترین جرم قرار دیا ہے۔ میں ابھی یہ عرض کرونگا کہ اس میں تذلیلِ انسانیت ہے۔ میں نے پچھلے درس میں عرض کیا تھا کہ انسان کو جو چیز اشرف بناتی ہے وہ اس کا اختیار و ارادہ ہے۔ کوئی عقیدہ' کوئی مسلک' جو انسان کو مجبور بتائے' وہ قرآن کی بنیادی تعلیم کے

خلاف ہے۔ یہ مجبور ہوا تو پھر اس کے کسی عمل کی ذمہ داری اس پہ آتی ہی نہیں ہے۔ مجبور پہ تو ذمہ داری نہیں آتی اور قرآن کی ساری تعلیم کا نکتہ ماسکہ یہ ہے کہ انسان کا ہر عمل یہاں تک کہ دل میں گزرنے والا خیال بھی نتیجہ پیدا کر کے رہتا ہے: اچھا عمل اچھا نتیجہ' خراب عمل خراب نتیجہ۔ یہ اسی صورت میں ہی اپنے اعمال کے نتائج کا ذمہ دار ہوتا ہے جب یہ صاحبِ اختیار ہو' بالارادہ ہو۔ جو اپنے ارادے سے کچھ کر ہی نہیں سکتا تو اس کام کی ذمہ داری اس پہ کیسے عائد ہوسکتی ہے! قرآنِ کریم کی طرف سے یہ سلسلہ یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء کرام کا سلسلہ' وحی کا انبیاء کرام پر نازل ہونا' مکافاتِ عمل کا قانون' حیاتِ آخرت' وہاں کی ساری جنت جہنم اسی ایک نکتے کے گرد گھومتی ہے کہ انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے اور ذمہ دار وہی ہوسکتا ہے جو صاحبِ اختیار اور صاحبِ ارادہ ہو۔ ایک چیز آپ کہیے کہ ''یہ مجبور ہے' صاحبِ اختیار نہیں ہے'' تو یہ سارا سلسلہ رشد وہدایت معاذ اللہ بے کار ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کے معنی کچھ نہیں رہتے۔ اس لیے قرآن نے بڑی شدت سے اس کی مخالفت کی ہے۔ یہ نجومی کی بات نہیں' اسی سے تو بات آگے چلے گی۔ جسے آپ پیشین گوئیاں کہا کرتے ہیں وہ تو مجبور کے متعلق ہوتی ہے۔ آپ صرف مجبور کے متعلق پیش گوئی کر سکتے ہیں۔

صاحبِ اختیار اور مجبور میں فرق

عزیزانِ من! آج سے سو برس بعد' چاند کو کس وقت گرہن لگے گا' کس وقت چھٹ جائے گا' آپ آج اس کے بارے میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں۔ اس لیے کہ زمین اور سورج کی گردش قوانینِ فطرت کے مطابق ہوتی ہے' جو غیر متبدل ہیں اور انہیں اختیار نہیں ہے کہ وہ اس کے خلاف کچھ کر سکیں۔ جب ان قوانین کا علم حاصل کر لیا جائے اور وہ مجبور ہوں کہ ان کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے تو وہ تو پھر آسانی سے سو برس کیا' ہزار برس سے پہلے بھی' کوئی یہ کچھ بتا سکتا ہے۔ یہ چاند اور سورج قوانین فطرت کے مطابق چلنے پر مجبور ہیں' اس لیے چاند گرہن کے متعلق بتایا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس' آپ کو ایک Scientist (سائنسدان) کی بات یاد ہو گی' جو میں نے پہلے بھی بتائی تھی۔ وہ بڑی اہم چیز ہے۔ وہ سائنسدان Limitations of Science کا مصنف [1] ہے۔ وہ کہتا یہ ہے کہ ایک میز پہ بیٹھا ہوا ایک سائنسدان یہ بتا سکتا ہے کہ سو برس کے بعد چاند کو کس وقت گرہن لگے گا اور وہاں اسی میز پہ بیٹھے ہوئے دس سائنسدان یہ نہیں

---

[1] اس کتاب کا مصنف پروفیسر ڈبلیو۔ این سلیوان (Prof. W.N. Sullivan) ہے۔

بتا سکتے کہ یہ جو مکھی آ کر بیٹھی ہے وہ یہاں سے اڑ کر پھر کہاں بیٹھے گی۔ یہ دس سائنسدان کیوں نہیں بتا سکتے اور وہ ایک سائنسدان کیوں بتا سکتا ہے؟ یہ اس لیے کہ وہ ایک سائنسدان مجبور کے متعلق بات کر رہا ہے اور ان دس سائنسدانوں کے سامنے صاحبِ اختیار کے متعلق بات ہے۔ عزیزانِ من! اسے کہتے ہیں پہلے سے بتا دینا۔ وہ کہتا ہے مکھی کے متعلق نہیں بتا سکتے کہ یہ یہاں سے اڑی تو کہاں بیٹھے گی۔ اسی طرح کسی انسان کے متعلق بتانا کہ اس کے بعد وہ کیا کرے گا' انسان کو مجبور بنا دینے کے مرادف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعد میں ہونے والی چیز جو کسی قاعدے اور قانون کے تابع نہ ہو' وہ علم کے زمرے میں نہیں آتی۔

عزیزانِ من! جو بات قانون کے تابع کہی جائے گی وہ علم ہے۔ یہ جو صاحبِ اختیار کے متعلق اس طرح کہا جائے گا' وہ علم کے تابع نہیں آئے گا۔ اس لیے اس کے متعلق یہ کچھ کہنا کہ صاحب! تمہیں سال کے بعد نمونیا ہو جائے گا یا تمہیں بادشاہت مل جائے گی یا تم قید ہو جاؤ گے' یہ صاحبِ اختیار کے متعلق کہا جا رہا ہے۔ اسے علمِ غیب کہا جاتا ہے اور خدا نے کہا ہے کہ یہ خدا کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں ہے۔ خود نبیؐ کے متعلق کہا کہ رسول اللہ ﷺ' جو تمہیں آنے والے واقعات کے متعلق یہ کچھ باتیں بتاتے ہیں' تو یہ ہم نے انہیں وحی کے ذریعے دی ہیں۔ اگر یہ وحی کے ذریعے نہ دیں تو خود رسول بھی نہیں بتا سکتا کہ یہ کیا ہے۔ اسے بھی علمِ غیب حاصل نہیں ہے۔ تو جب کیفیت یہ ہے کہ رسول کو بھی یہ حاصل نہیں ہے' وہ بھی کسی انسان کے متعلق پیش گوئی نہیں کر سکتا تو یہ جو آئے دن آپ کے ہاں پیشین گوئیاں ہوتی ہیں' یہ آپ کے ہاں کا سارا سلسلہ ولایت اور تصوف انہی پیشین گوئیوں کے اوپر چلا آ رہا ہے' حتیٰ کہ ہمارے ہاں تو وہ [1] پیشین گوئیاں کر کے نبی بن گیا۔ ان سے اس بات پہ بحثیں ہوتی رہیں کہ نبی آ سکتا ہے یا نہیں۔ بات تو یہ تھی کہ کوئی انسان پیشین گوئی کر سکتا ہے یا نہیں۔ یا تو دعویٰ کرو کہ مجھے خدا کی طرف سے وحی ہوئی ہے اور اس نے مجھے بتایا ہے کہ تم نبی ہو گئے ہو۔ بات اس پہ چلے گی۔ جب خدا یہ کہتا ہے کہ کسی انسان کو حتیٰ کہ کسی رسول کو بھی علمِ غیب حاصل نہیں بجز اس کے جو ہم وحی کے ذریعے اس کو دیں گے تو آپ سوچیے کہ پھر یہ پیشین گوئیاں کرنا' یہ نجوم کے ذریعے قسمت کا حال بتانا' یہ فٹ پاتھ پہ بیٹھے ہوئے طوطوں سے قسمتیں معلوم کرنا' ہاتھ کی لکیروں کے ذریعے سے یہ کہنا کہ یہ کچھ ہو گا' کیا یہ سب تماشا نہیں ہو رہا ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ ہم قرآن سے مہجور ہو گئے۔ اگر ہم اس سے راہنمائی لیں تو وہ بات بتا دیتا ہے کہ خاکِ زندہ ہے تو تابع ستارہ نہیں۔

---

[1] یہ اشارہ مرزا غلام احمد آف قادیان (1835-1908) کی طرف ہے۔

قرآنِ حکیم کا حکم

جب بھی کوئی عقیدہ اس خاکِ زندہ کو خاکِ مردہ میں تبدیل کرے گا تو یاد رکھیے اور سنیے کہ قرآن کیا کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ: وَلِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ ❶ (67:6) کفر ہے۔ جو کچھ یہ مانتا ہے وہ اپنی ذات سے کفر کرتا ہے' اپنے صاحبِ اختیار اور ارادہ ہونے سے انکار کرتا ہے۔ یہی کفر ہے۔ جو اسے یہ کچھ بتاتا ہے کہ اپنے صاحب اختیار و ارادہ ہونے سے انکار کرو' وہ جھوٹ بھی بولتا ہے اور خدائی قوت بھی اختیار کرتا ہے کیونکہ یہ علمِ غیب صرف خدا کو حاصل ہے اور وہی اس کا مدعی ہوتا ہے' اس لیے وہ خدا سے انکار کرتا ہے۔ یہ دونوں کافر ہیں۔

قوموں کی جہنمی زندگی

قرآن کہتا ہے کہ یہ اپنے اختیار و ارادہ کے مالک ہونے سے انکار کرنے والا منکرِ خویش ہے اور وہ خدائی قوت کا انکار کرنے والا منکرِ خدا ہے۔ وَلِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ ط وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ❷ (67:6)۔ عزیزانِ من!

عاقبت کا عذاب تو وہاں جا کے معلوم ہوگا۔ جو قومیں اپنے آپ کو صاحبِ اختیار ہی نہیں سمجھتیں اس دنیا میں ذلت و خواری کے جس جہنم کے اندر محصور رہتی ہیں وہ تو ہمیں معلوم ہے۔ ان کے گھروں کے قوانین اور پالیسیاں دوسری قوتیں مرتب کرتی ہیں۔ اس سے بڑا جہنم کیا ہوگا! جہنم کے داروغے کو خدا نے مالک (43:77) کہا ہے۔ یہ قوتیں ان کی Masters (آقا و مالک) ہوتی ہیں' یہ اقوام صاحبِ اختیار نہیں ہوتیں اگرچہ اپنے آپ کو Sovereign Powers (اقتدارِ مطلق کی مالک) کہتی ہیں مگر یہ جھوٹ ہوتا ہے۔ یہ جہنم وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ہے۔ یہ عجیب بات آتی ہے۔ قرآنِ کریم نے جرائم کی پاداش میں جہنم کا ذکر بار بار کیا ہے۔ قرآن کہیں جحیم کہتا ہے' کہیں جہنم کہتا ہے' کہیں النار کہتا ہے' وہ بھی ٹھیک ہے۔ اس مقام پر جہنم کہا ہے۔ آگے جہنم کی جو کچھ تفصیل دی ہے' وہ اتنی شدید ہے کہ اس سے نظر آتا ہے کہ جتنا شدید' جتنا سنگین یہ جرم ہے' اسی کے مطابق اس جیل خانے یعنی جہنم کی تفصیل بتائی ہے۔ کہا ہے کہ اِذَآ اُلْقُوْا فِيْهَا سَمِعُوْا لَهَا شَهِيْقًا وَّهِيَ تَفُوْرُ

---

❶ اور جو لوگ بھی' اپنے نشو و نما دینے والے کے قوانین کی' زندگی کے کسی بھی گوشے میں' خلاف ورزی کرتے ہیں۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ اور جو لوگ بھی' زندگی کے کسی گوشے میں' قوانین خداوندی کی خلاف ورزی کرتے ہیں' ان کا انجام تباہی اور بربادی ہوتا ہے اور یہ بہت برا انجام ہے۔ (ایضاً)

(67:7) جب وہ اس میں ڈالے جائیں گے تو ان کی کرب انگیز، دہشت انگیز، چیخ و پکار سنائی دے گی۔ وہ جہنم ایسے ہوگا جیسے کہ وہ اچھل رہا ہے، بھڑک رہا ہے: تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ (67:8)۔ جیسے یہ کہتے ہیں کہ غصے کے مارے آپے سے باہر ہو رہا ہے یعنی اس سے جرم کی شدت یا سنگینی کی نوعیت پتہ چلتی ہے۔ یہ قرآن نے سزا کی شدت اور سنگینی بتائی ہے ورنہ اگر صرف جہنم ہی کہتا تو بھی یہ بات کافی تھی۔

میں نے عرض کیا ہے کہ اپنے صاحب اختیار وارادہ ہونے سے انکار کرنے سے بڑا سنگین جرم اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ یہ ایک ہی چیز ہے جو خدا نے انسان کو دی ہے۔ یہ خصوصیت جو خدا نے انسان کو عطا کی ہے اس نے اسے ''روحنا'' کہا ہے یعنی اپنی توانائی۔ وہ خدا کی توانائی ہے۔ انسان کے صاحبِ اختیار وارادہ ہونے کی اس حیثیت کا انکار کرنا، سب سے بڑا جرم ہے اور کسی کا اپنے آپ کے متعلق یہ سمجھنا تذلیلِ انسانیت ہے۔ اپنی ذلت کو قبول کرنا ہے۔ یہ اتنا بڑا شدید جرم ہے جس کی وجہ سے جہنم کے بعد یہ سب کچھ کہا۔ اور اس کے بعد ہے کہ كُلَّمَآ اُلْقِىَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ (67:8) جب یہ پیشین گوئیاں کرنے والے اور قسمتیں بتانے والے اور انہیں ماننے والے اس میں فوج در فوج ڈالے جاتے ہیں تو جہنم کے داروغے ان سے پوچھتے ہیں۔ قرآن کا انداز تشبیہی ہوتا ہے۔ جہنم کے داروغے ان سے پوچھتے ہیں کہ کیا تمہارے ہاں کوئی ایسا نہیں آیا تھا جس نے بتایا ہو کہ یہ جو تمہارے عقائد اور مسالک ہیں، ان کا نتیجہ کیا ہے؟ یہ کفر ہے، یہ شرک ہے، کیا کسی نے تمہیں نہیں بتایا تھا؟

تباہی سے پہلے دو شرطوں کا پورا کرنا

عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے بار بار یہ کہا ہے کہ کسی قوم پر ہمارے قوانین کی رو سے تباہی نہیں آتی تاوقتیکہ پہلے دو شرطیں پوری نہ ہو جائیں۔ ایک یہ ہے کہ ان تک یہ بات پہنچ نہ جائے کہ تمہاری روش تباہی لانے والی ہے۔ اسے تنذیر کہتے ہیں۔ انہیں Warn (آگاہ) کر دیا جائے کہ جس روش پہ تم چل رہے ہو اس کا نتیجہ تباہی ہے۔ یہ ایک شرط ہے اور دوسری شرط یہ ہے کہ ان میں یہ صلاحیت موجود ہو کہ وہ اسے سمجھ جائیں کہ یہ کیا بات کہہ رہا ہے! کیا بات ہے اس قسم کے جج کی!! یہ کتنی عجیب شرطیں ہیں! کہ اس میں سمجھنے کی صحت ہو۔ پاگل تو جرم ہی نہیں کر سکتا، اسے کوئی بھی مجرم نہیں قرار دیتا: سمجھنے کی صلاحیت ہو اور وہ بات اس تک پہنچ چکی ہو۔

خاکِ زندہ سے خاکِ مردہ تک

عزیزانِ من! ان سے کہا جائے گا کہ تم جو اس قسم کے جرائم کے مرتکب ہوئے' تم نے جو اپنے آپ کو خاکِ زندہ سے خاکِ مردہ سمجھ لیا' کیا تمہیں کوئی بتانے والا نہیں آیا تھا کہ تمہارا مقام کیا ہے۔ یہ وہی بات ہے کہ بتانے والا آیا تھا یا نہیں۔ آگے کہا کہ قَالُوْا بَلٰی قَدْ جَائَنَا نَذِیْرٌ (67:9) وہ کہیں گے کہ ہاں' ہمارے پاس ایسا آگاہ کرنے والا آیا تو تھا۔ اب عزیزانِ من! یہ یاد رکھیے کہ نبی اکرم ﷺ تک یا حضورؐ سے پہلے جو یہ آنے والے تھے یہ انبیاء کرام تھے۔ ٹھیک ہے انبیاء کرام کے بعد ان کے جو متبعین تھے' جو صالحین تھے' وہ یہ فریضہ ادا کرتے تھے۔ وہ بھی نذیر تھے لیکن انبیاء کرام بہرحال آتے تھے۔ نبی اکرم ﷺ تو آخری نبی ہیں۔ ان کے بعد نبیوں کے سلسلے کا کوئی نذیر تو نہیں آئے گا لیکن رسول اللہ ﷺ سے بھی یہ کہا گیا تھا: لتنذر بہ (7:2) قرآن کے ذریعے تم نے یہ وارننگ دینی ہے۔

وارثانِ امت کا فریضہ

جب قرآن کو ابدی طور پہ محفوظ کر دیا اور اس امت کو وارثِ کتاب قرار دے دیا تو اب رسالتِ مآب حضور کے بعد پھر ضرورت ہی نہ رہی کہ کوئی اور نبی آ کے یہ وارننگ دے یا تنذیر کا یہ فریضہ ادا کرے۔ وہ تو قرآن کے ذریعے سے ادا کرنا تھا۔ قرآن محفوظ ہے' موجود ہے۔ امت کو اس کا وارث قرار دیدیا۔ اب یہ فریضہ اس پہ عائد ہو گیا کہ یہ وارن کرے اور جو امت خود ہی ان جرائم کی مرتکب ہو رہی ہو اس نے دوسروں کو کیا وارن کرنا ہے لیکن بہرحال یہ تھا کہ ان کے چوکیدار پوچھیں گے کہ کیا تمہاری طرف کوئی نذیر آیا تھا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ کوئی نبی آیا تھا یا نہیں۔ یہی چیز ہے کہ یہ جو ہم نے وارننگ دی تھی' یہ جس کتاب میں موجود تھی' کیا کوئی ایسا نہیں تھا کہ جس نے اس کتاب کی اس تعلیم کو تم تک پہنچایا ہو؟ یہ فریضہ کتنا بڑا ہے جو امت پر عائد ہوتا ہے۔ امت خود اس جرم کی بھی مجرم ہو رہی ہے۔

عزیزانِ من! ہم جو عذاب آئے ہوئے ہیں قرآن ان کی ایک ایک شق بتاتا ہے کہ تمہارے کیا کیا جرائم ہیں جس کی وجہ سے تم اس قدر ذلت آمیز عذاب کے اندر مبتلا چلے آ رہے ہو۔ سب سے بڑا عذاب' جو میں نے کہا ہے' وہ یہ ہے کہ جہنم کے داروغے کا نام مالک (43:77) ہے۔ انسان کی انسان پر محکومیت دنیا کے اندر سب سے بڑا جہنم ہے۔ ہاں تو بات یہ چلی آ رہی تھی کہ انہوں نے جہنم کے مالک سے کہا کہ ہاں آئے تو تھے۔ پوچھا کہ پھر تم نے کیا کیا؟ انہوں نے کہا کہ فَکَذَّبْنَا (67:9)۔ ہم نے تکذیب کی۔ ہم نے کہا: نہیں' تم جھوٹ بولتے ہو' تم جو کچھ کہتے ہو کہ اس کے نتیجے میں ہمیں عذاب

آ جائے گا' تباہی آ جائے گی' ہم ذلیل ہو جائیں گے' خوار ہو جائیں گے' یہ سب جھوٹ کا پلندا ہے۔ ہم نے ان سے بار بار کہا کہ تم جھوٹ بولتے ہو اور آگے بات ہے کہ وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ (67:9) ہم نے کہا کہ تیری طرف خدا کی کوئی وحی وغیرہ نہیں نازل ہوتی۔ ہم نے الٹا ان لوگوں کو مطعون کیا جو ان کا اتباع کرتے تھے اور برملا کہا کہ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ کَبِیْرٍ (67:9) تم بڑی گمراہی میں پڑے ہو۔ ہم بالکل ٹھیک راستے پر چل رہے ہیں۔ آگے بات ہے کہ وَقَالُوْا لَوْ کُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا کُنَّا فِیْٓ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ [1] (67:10)۔

عقل وفکر سے کام نہ لینے والا جہنمی ہوگا

عزیزانِ من! اس آیت (67:10) میں عجیب چیز کہی ہے۔ یہ کیا چیز تھی جو قسمتیں بتا رہے تھے اور تم مان رہے تھے؟ نہ تو وہ کسی عقل وفکر کی رو سے کہتے تھے کہ یوں ہوگا اور اس میں یہ ہوگا۔ وہ تو بس جیسے علمِ غیب ہے کہ بس یوں ہوگا۔ نہ تم ہی عقل و فکر کی رو سے کسی نتیجے پہ پہنچتے تھے کہ بھئی! ایسا کیوں ہوگا؟ اس میں کیوں کا تو کوئی جواب ہی نہیں ہوتا۔ سنیئے' عزیزانِ من! وہ جہنم میں ڈالے جانے والے کیا کہہ رہے ہیں؟ کہا کہ اگر ہم ان کی بات غور سے سنتے (نسمع) اور پھر عقل وفکر سے کام لیتے (اونعقل) تو آج جہنم میں کیوں ہوتے۔ اب قرآن نے بتا دیا کہ جہنم میں کون لوگ جاتے ہیں۔ اور پھر اس کی تشریح اور تفسیر تو قرآن نے مختلف مقامات پر بتائی ہوئی ہے۔ قرآن عقل وفکر وتدبر وتفکر اور شعور پر بہت زیادہ زور دیتا ہے اور یہاں جہنم کی بات تو قرآن نے دو لفظوں میں ہی بتا دی کہ وہ خود اعتراف کریں کہ اگر ہم بات غور سے سن لیتے اور عقل وفکر سے کام لیتے تو ٹھیک تھا پھر ہم اٹکلوں' پیشین گوئیوں' قسمت کا حال بتانے والوں' نجومیوں اور پامسٹوں کی یہ باتیں کیوں مانتے' پھر ہم جہنم میں کیوں آتے۔ میں اس کی تفصیل میں ایک ہی اور آیت پیش کرونگا۔ سورۃ اعراف کی آیت ہے کہ وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ کَثِیْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ [2] (7:179)۔ پہلے تو اس کا ترجمہ ہی دیکھیں۔ ہمارے ہاں جو ترجمے

---

[1] اور انہوں نے کہا کہ اصل یہ ہے کہ ہم نے عقل وفکر سے کام ہی نہ لیا۔ یونہی تعصب' ہٹ دھرمی اور اندھی تقلید کی بنا پر ان کی مخالفت کرتے رہے۔ اگر ہم بگوشِ ہوش ان کی بات سنتے اور عقل وفکر سے کام لیتے تو آج جہنم میں کیوں ہوتے؟ .....جہنم میں جاتا ہی وہ ہے جو عقل وفکر سے کام نہیں لیتا۔ (7:179)

[2] اور انسانوں کی اکثریت کا یہ عالم ہے کہ ..... مہذب اقوام ہوں یا جاہل بادیہ نشین ..... وہ زندگی' جہنم میں گزارتے ہیں۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

ہوئے ہیں وہ غلط راستے پہ ڈال دیتے ہیں۔اس آیت کے ترجمے کیے جاتے ہیں کہ ''خدا نے کہا کہ ہم نے جن وانس کی کثرت کو جہنم کے لیے پیدا کیا ہے۔'' ذرا سوچیے کہ اگر انہیں خدا نے جہنم کے لیے ہی پیدا کر دیا تو اب یہ جنتی کیسے بن سکتا ہے؟ ان تراجم میں کہتے ہیں کہ ہم نے انہیں جہنم کے لیے پیدا کیا ہے۔آپ سوچتے ہیں کہ یہ تراجم کہاں لے جاتے ہیں۔پھر ان تراجم میں جنات کی بات ہے۔وہ انہیں بھی جہنم میں بھیجتے ہیں۔میں نے کئی دفعہ بتایا ہے کہ عربی محاورے میں' اور عربی زبان کے استعمال میں قرآن کا یہ اعجاز ہے کہ یہ جو وہاں صحرائی آبادیاں تھیں' شہروں سے دُور دُور رہنے والی وہ عرب انہیں صحرائی آبادی کہتے تھے اور وہاں کے رہنے والے خانہ بدوش کہلاتے تھے اور آج بھی وہاں عرب کے اندر وادیٔ حجاز کے اندر' تو شہر ہی دو تین ہیں' وہ بھی اب ذرا ماڈرن ہوئے ہیں تو ان کو شہر کہا جا سکتا ہے ورنہ وہ بھی قصبے ہی تھے اور وہ دو تین ہی تھے۔باقی سارا ملک صحرائی آبادی تھی' خانہ بدوش تھا' آج یہاں' کل وہاں' آنکھوں سے دُور۔تو جو چیز بھی آنکھوں سے نہاں ہو' اسے عربی زبان میں جن کہتے ہیں اور انس وہ ہوتے ہیں جو Socially' مل جل کر' رہنے والے ہوں۔اس طرح شہری آبادیوں کو وہ انس کہتے تھے اور ان دیہاتی اور صحرائی آبادیوں کو جن کہتے تھے۔

عقل وفکر سے محروم لوگ

قرآن نے یہ کہا ہے کہ یہ ایسے لوگ ہیں جو اپنی زبانِ حال سے پکار کر کہہ دیں گے کہ ہم جہنم کے رہنے والے لوگ ہیں۔کون ہیں یہ لوگ؟ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا (7:179) سمجھنے سوچنے کی صلاحیت تو رکھتے ہیں مگر اس سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے۔عزیزانِ من! آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن اہلِ جہنم کی کیا بات بتا رہا ہے۔یہ ان کے اختیار کی بات ہے۔لَهُمْ قُلُوْبٌ (7:179) قرآن کے الفاظ دیکھیے: لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ❶ (7:179)۔اگر یہ ہوتا کہ ان میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے تو صرف لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ہوتا۔تو پھر سارے مجبور ہو جاتے۔پہلے وہ کہتا ہے کہ ان میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت موجود ہے' اس کے باوجود اس سے سوچنے سمجھنے کا کام نہیں لیتے۔یہ جہنم کی پہلی چیز ہے اور آگے ہے کہ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا (7:179) آنکھیں رکھتے ہیں مگر ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔آنکھیں رکھتے ہیں! پھر ہے کہ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا (7:179) کان رکھتے ہیں مگر ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔اندھے' بہرے' گونگے' بنے رہتے ہیں' عقل وفکر سے کام نہیں لیتے۔اب پتہ چل گیا کہ وہ کون لوگ ہیں جو جہنم میں جانے کے لیے اپنے آپ کو تیار کر رہے ہیں۔یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے قرآنِ کریم نے کہا کہ وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ ❷

---

❶ وہ قلوب سے سوچنے سمجھنے کا کام نہیں لیتے۔ ❷ یہ لوگ ہیں جو جہنمی زندگی گزارتے ہیں۔

(7:179) یہ وہ لوگ ہیں جو ہمارے ''لَوْ کُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ'' قانون کو توڑ رہے ہیں۔ یہ لوگ ان سننے اور عقل وفکر کی صلاحیتوں کو رکھنے کے باوجود ان سے کام نہیں لیتے۔ یہ لوگ ہیں جو جہنم میں جانے کے لیے اپنے آپ کو تیار کر رہے ہیں۔ جہاں کہیں ایسے لوگ نظر آئیں' سمجھ لو کہ یہ اہلِ جہنم ہیں۔ یہیں اسی دنیا کے اندر پہچان ہوگئی کہ اہلِ جہنم کون لوگ ہیں: وہ جو عقل وفکر سے کام نہیں لیتے۔ اب آپ کے ہاں کا جو مروج اسلام یا شریعت چلی آ رہی ہے اس میں عقل سے کام لینا ہی ممنوع ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ایسے لوگوں کی تو صورت وکیفیت ہی بتا دیتی ہے کہ یہ جہنم کے رہنے والے لوگ ہیں۔ آگے قرآن کریم نے کہا کہ اُولٰئِکَ کَالْاَنْعَامِ (7:179) یہ لوگ انسان نہیں' بالکل حیوان ہوتے ہیں۔

مکھی سے بھی گئے گزرے

عزیزانِ من! پہلے جو کہا کہ یہ انسانی سطح کے اوپر نہیں' حیوانی سطح پہ ہیں اور اس کے فوراً ہی بعد یہ کہا کہ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ (7:179) بلکہ ان حیوانوں سے بھی زیادہ راہ گم کردہ۔ یہ تو مکھی سے بھی گئے گزرے ہیں۔ وہ بھی اپنے اختیار سے اڑ کر' جہاں جی چاہے بیٹھے مگر یہ حیوانات عقل وفکر سے کام لیتے ہی نہیں۔ کسی گائے پہ بھی دھوپ آ جاتی ہے تو وہ اٹھ کے سائے میں چلی جاتی ہے۔ یہ حضرت انسان نہیں اٹھتا۔ یہ کہتا ہے کہ خدا نے میری قسمت میں لکھا ہی ایسا ہے تو میں وہاں سے کیسے اٹھ سکوں۔ عقل وفکر سے کام نہیں لیتا۔ آگے کہا کہ اُولٰئِکَ ھُمُ الْغٰفِلُوْنَ (7:179) بے خبر رہتے ہیں۔ کیا بات ہے غٰفلون کی! کہ سب کچھ رکھتے ہیں لیکن اس کی طرف سے بے خبر ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ یہ چیزیں نہیں ہیں۔ یہ سب چیزیں ہیں' ان کو کام میں نہیں لاتے۔ یہ ہے جو انہوں نے کہا کہ لَوْ کُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا کُنَّا فِیْٓ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ (67:10) اگر ہم غور سے ان کی بات سنتے اور پھر عقل وفکر کی رو سے اسے جانچتے پہچانتے تو آج ہم جہنم میں کیوں ہوتے۔

قرآن کا بلا معنی سننا اور بلا سمجھے پڑھنا

عزیزانِ من! جہنم سے الگ ہونے یا جہنم سے بری ہونے کی بات ایک ہی ہے۔ اس کا معیار قرآن نے بتا دیا کہ جو بات کہی جائے کہ خدا نے یہ کہا ہے' اس کو غور سے سنا جائے اور پھر عقل وفکر سے کام لے کر اس کے مطابق عمل کیا جائے۔ عقل وفکر سے کام لیا جائے۔ یہاں ہمارے ہاں جو سمع' یعنی سننا ہے' وہ سننا ایسا ہی ہے۔ قرآن جتنا سنا جاتا ہے کوئی کتاب ایسی نہیں جو اتنی سنی جائے۔ وہ ایسا سنا جاتا ہے کہ جس کے بعد عقل وفکر کا اس میں دخل نہیں ہوتا: بلا معنی الفاظ سنے جاتے ہیں جن کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا' جس کے معنی معلوم نہیں ہیں' ناظرہ پڑھ رہے ہیں' حافظ سے سن رہے ہیں' نہ حافظ صاحب کو علم ہے جو

میں پڑھ رہا ہوں اس کے معنی کیا ہیں' نہ سننے والے کو علم ہے کہ جو میں سن رہا ہوں اس کے معنی کیا ہیں۔ تو کیا اس سننے کو سننا کہیں گے؟ ان جہنم میں جانے والوں نے جو کہا ہے کہ اگر ہم سنتے اور پھر عقل وفکر سے کام لیتے تو کبھی جہنم میں نہ جاتے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ جو الفاظ سنیں' ان کے معنی معلوم کریں۔ جن الفاظ کے معنی آپ کو معلوم نہ ہوں تو اس کے بعد ان الفاظ پہ عقل وفکر سے غور کرنے کے معنی ہی کچھ نہیں ہوتے۔ اسی لیے تو کہا کہ اُولٰئِکَ کَالْاَنْعَامِ (7:179) یہ لوگ انسان نہیں' بالکل حیوان ہوتے ہیں۔ وہ تو ایسے ہی ہے جیسے آپ نے ایک بھینس کو بھی سنا دیا اور ایک انسان کو بھی سنا دیا۔ اسی لیے سورۃ الملک میں کہا کہ مَا کُنَّا فِیْٓ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ o فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْبِھِمْ [1] (67:10-11) یہ تھے وہ لوگ جنہوں نے اپنے گناہ کا اعتراف کیا۔ یہ بھی ایک عجیب اصول ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن کے مقامات ایسے اصول بیان کر جاتے ہیں جہاں سے مملکتوں کے دستور بھی مرتب ہو سکتے ہیں اور قوانین کے ضابطے بھی۔

ضابطہ انصاف کے دو بنیادی اصول

اب یہاں انہی دو آیتوں سے آپ دیکھیے کہ کیا ضابطہ قانون مقرر ہوتا ہے' کونسا قانون مقرر ہوتا ہے؟ اس سے یہ متعین ہوتا ہے کہ جس کو سزا دی جا رہی ہے یا سزا دی جانی ہے یا جس کو مجرم قرار دیا جانا ہے' پہلے اس سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ کیا تم تک یہ قانون پہنچ چکا تھا جس کی رو سے تمہیں اب یہ سزا دی جا رہی ہے۔ تو کسی کو مجرم قرار دینے کی پہلی چیز یہ ہوگئی کہ اس تک وہ قانون پہنچ چکا ہو۔ غور کیجیے گا کہ یہ کتنی بڑی اہم شق ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ ''اَوْ نَعْقِلُ'' اس میں اس قانون کے سمجھنے کی صلاحیت ہو۔ اگر نہ ہو تو سمجھانے والے موجود ہوں۔ وہ جہنم کے چوکیدار (67:8) نے جو کہا ہے کہ کیا وہ تمہارے پاس نہیں آئے تھے جنہوں نے تمہیں وارننگ دی تھی کہ ایسا کرو گے تو ایسا ہو جائے گا۔ تو معلوم ہوا کہ مملکت کے لیے یہ ضروری ہے کہ ایسا انتظام کرے کہ ہر فرد تک وہ قانون اس شکل میں پہنچے کہ وہ سمجھ جائے کہ قانون کا مطلب کیا ہے۔ پھر یہاں سے اس کی اگلی شق یہ مرتب ہوئی کہ ہر مجرم یا ملزم کو اس کا موقعہ بہم پہنچایا جائے کہ وہ Explain (واضح) کرے' وہ اپنی مدافعت میں جو کہنا چاہتا ہے' کہے۔ اسی لیے کہا ہے کہ ابھی جہنم کے اندر نہیں گئے ہیں' وہ باہر ہی ہیں۔ وہ چوکیدار جو اس سے باہر ہیں' پوچھتے ہیں کہ کیا تمہاری طرف یہ وارن کرنے والے آئے تھے یا نہیں آئے تھے۔ اب انہیں موقعہ دیا گیا۔ نہیں آئے ہوں تو وہ وہیں کہہ دیں کہ نہیں صاحب! ہم تک تو نہیں آئے تھے' پھر ان کے اوپر کوئی جرم ہی عائد نہیں ہوگا۔

---

[1] آج ہم اس جہنم میں نہ ہوتے۔ وہ اس طرح عذاب کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ کر اپنے جرائم کا اقرار و اعتراف کرتے ہیں۔

انہیں جہنم میں نہیں بھیجا جائے گا۔ تو گویا ہر ملزم کو یہ موقعہ بہم پہنچانا چاہیے کہ وہ اپنی Defence 'اپنی مدافعت' میں جو کہنا چاہتا ہے' کہے۔

مدافعت کا حق اور قرآنِ حکیم سے قوانین سازی کا طریق

خدا نے تو ابلیس سے بھی یہ کہا تھا کہ تو نے کیوں سجدہ نہیں کیا۔ اپنی پوزیشن Explain (واضح) کرنے کا اس کو بھی موقع دیا تھا۔ اپنی مدافعت میں جو کچھ وہ کہنا چاہے اس کے لیے خود پوچھا۔ تو گویا یہ چیز بھی آئی کہ قانون وہی قانون کہلائے گا کہ جس میں ملزم کو یہ پورا موقعہ دیا جائے کہ اس نے مدافعت میں جو کہنا ہے وہ کہے۔ اس کے بعد اگر وہ چیز جرم ثابت ہوتی ہو تو پھر وہ مستوجبِ سزا قرار پائے گا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن میں یہ ضروری نہیں کہ یہ احکام یا قوانین' قوانین کی شکل میں ہی دیئے گئے ہوں' اس میں جو اصول دیئے گئے ہیں' وہاں سے قوانین مستنبط ہو جاتے ہیں۔ یہ طریقہ ہے قرآن سے قوانین سازی کا۔ [1] ابلیس جیسے ملزم کو بھی جب بغیر مدافعت پیش کیے مستحقِ سزا نہیں قرار دیا جاتا تو اور پھر دوسرے کون ہیں جو مستوجب سزا قرار دیں۔ خدا بھی ان سے پوچھتا ہے۔ وہ تو اتنی بڑی مطلق قوتوں کا مالک ہے اور پھر اسے علم بھی ہے اس کے باوجود وہ یہ چیزیں اس لیے قرآن میں بیان کرتا ہے کہ یہ ہمارے لیے ہدایت اور Guidance اور راہنمائی ہے کہ قوانینِ مملکت کے اندر یہ چیزیں ہونی چاہئیں۔ اس انداز سے یہ ساری بات آئی ہے کہ فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْبِهِمْ (67:11) انہوں نے اپنے جرم کا خود اعتراف کیا ہے۔ یہ سارے دلائل اس طرح سے بیان ہو جائیں اور ملزم کو معلوم ہو کہ بنائے ہوئے گواہ بھی جھوٹے نہیں ہیں اور یہ جج بھی کسی کے کہنے پہ نہیں چلے گا: وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ [2] (7:181)

انصاف کی شرط: قانون کا بذاتِ خود عدل پر مبنی ہونا ضروری ہے

قرآن نے عدل کہا ہے۔ اسے آپ قانونی عدل بھی کہتے ہیں۔ یہ وہی ہے جس کا نام ہمارے ہاں Justice (انصاف) رکھا جاتا ہے۔ ساری دنیا میں Justice (انصاف) کی Definition یا تعریف یہ ہے کہ مروجہ قانون کے

---

[1] اس نکتے کی مکمل تفصیل کے لیے ادارہ طلوعِ اسلام کی طرف سے شائع کردہ یہ پمفلٹ ملاحظہ فرمایئے:
Prof. Dr. Manzoor-ul-Haque (Compiled): Quranic Constitution in an Islamic State: The Basis of Legislation and Outlines of the Constitution, Idara Tolu-e-Islam (Regd), Lahore, October, 2002.

[2] اور اس کے ذریعے اعتدال اور توازن کو ہمیشہ برقرار رکھتے ہیں..... اسی کو حق و عدل کے ساتھ فیصلے کرنا کہتے ہیں۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

مطابق جو فیصلہ ہو' اسے عدل کہتے ہیں۔ ساری دنیا میں یہ مسلمہ ہے۔ اور قرآن' جس کی تعلیم بے مثال ہے' کہتا ہے کہ اگر وہ قانون ہی بے عدل ہو' عدل پہ مبنی نہ ہو تو اس کی رو سے دیا ہوا فیصلہ عدل کیسے کہلائے گا؟ پہلے اس قانون کا مبنی بر عدل ہونا ضروری ہے۔ اسی لیے اس نے کہا کہ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ (7:181) صحیح مملکت وہ ہے جو اس الحق یا اس Truth (صداقت) یا اس قرآن کے مطابق فیصلے دے' پھر وہ عدل کہلائے گا۔ جب یہ صورت ہو کہ وہاں یہ یقین ہو کہ یہ شاہد ایسے ہیں کہ جو بنائے ہوئے نہیں ہیں یا بنائے نہیں گئے' جج بھی میرے خلاف کوئی اس قسم کی چیز نہیں کرے گا' یہاں نہ کوئی سفارش قبول ہوگی' وہ جو قرآن نے کہا ہے نہ سفارش قبول ہو سکتی ہے نہ کفارہ دے کر چھوٹا جا سکتا ہے' نہ کوئی اس کی جگہ کھڑا ہو سکتا ہے' نہ کوئی اس کی مدد کر سکتا ہے۔ یہ اس قسم کا عدل کا نظام ہے۔ ان چیزوں کا یقین ہو کہ جو فردِ جرم عائد کی جائے اس میں مدافعت کا پورا موقعہ دیا جائے پھر اس کے بعد اس پہ جو فردِ جرم عائد کی جائے وہ اتنی معقول ہو کہ وہ سمجھیں بھی اور کہیں بھی کہ بات ٹھیک ہے۔ اس کے بعد کہا کہ فَسُحْقًا لِّاَصْحَابِ السَّعِيْرِ (67:11) یہ ہیں وہ اصحاب سعیر جن کے لیے واقعی بہت ہی محرومیاں ہیں۔ زندگی کی جتنی بھی محرومیاں ہو سکتی ہیں وہ ان کا حصہ ہیں۔ وہ زندگی کی خوشگواریوں سے بہت دُور ہٹ جاتے ہیں۔ عذاب یہ ہے کہ انہیں زندگی کی خوشگواریوں اور فراوانیوں سے محروم کر دیا جائے گا۔ یہ ہے حقیقت میں عذاب۔ ان کے برعکس ایک دوسرا گروہ بھی ہے جس کے لیے قرآن کہتا ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ كَبِيْرٌ [1] (67:12)۔ یہاں ایک لفظ ''غیب'' بھی کہا۔ جو خدا کے قوانین سے خطرے یا خوف یا اس بات کا بالغیب احساس رکھتے ہیں کہ اگر ان کی خلاف ورزی کی تو اس کا نتیجہ تباہی ہوگا' عذاب ہوگا۔

بالغیب کیا چیز ہے؟

یہاں یہ ''بالغیب'' کیا چیز ہے؟ ایک چیز تو ایسی ہوتی ہے جسے وہ ہاتھوں پہ سرسوں جمائی ہوئی کہتے ہیں۔ اسے یوں سمجھو کہ ماچس یوں کی' بس آگ نکل آئی' فوری سامنے آ گئی ہے۔ اس ماچس کو یوں کرنے کا نتیجہ فوری سامنے آ جاتا ہے۔ چیز یہ ہے کہ تم یقین رکھتے ہو یا نہیں کہ یوں کرنے سے اس میں سے آگ نکل آئے گی۔ اس نے ثبوت کے لیے کہا: ٹھیک یوں کیجیے آگ نکل آئی۔ اس کے برعکس ایک عمل وہ ہے جو کسان کی طرح ہے۔ بڑی محنت اور مشقت سے وہ زمین کو تیار کرتا

---

[1] جو لوگ خدا کے قانونِ مکافات کی رو سے' اپنے اعمال کے اَن دیکھے نتائج کو اپنی نگاہوں میں رکھتے ہیں اور غلط اعمال کے عواقب سے خائف رہتے ہیں' ان کے لیے ہر قسم کی تباہیوں سے بچنے کا سامان ہے اور ان کی محنتوں کے نہایت شاندار نتائج ہیں۔ (ایضاً)

ہے' پانی دیتا ہے' پھر وہ بیج کاشت کر دیتا ہے۔ نہایت عمدہ تندرست وتوانا بیج' جسے کہا جاتا ہے کہ وہ اسے مٹی میں دبا دیتا ہے۔ روز صبح آتا ہے' سارا دن وہ اس کھیت کی دیکھ بھال اور حفاظت کرتا ہے' پانی دیتا ہے' اس میں سے جھاڑ جھنکاڑ الگ کرتا ہے' شام کو خالی ہاتھ اسی طرح واپس چلا جاتا ہے۔ ایک دن نہیں' دو دن نہیں' مہینوں یہ کچھ کرتا رہتا ہے' اس کی محنت کا کوئی ثمر اس کے سامنے نہیں آتا۔ وہ روز یہ کیوں کرتا ہے؟ کونسی یقین کی بات ہے جو اس کو ہر روز آمادہ کر دیتی ہے کہ شام کو خالی ہاتھ واپس آئے' صبح پھر اسی طرح سے وہاں چلا جائے؟ وہ کونسی بات ہے جو اس سے یہ کچھ کراتی ہے؟ اس بات پر ایمان کہ اس دانے سے فصل اُگے گی اور اس سے اتنی فصل میرے پاس آئے گی۔ اسے کہتے ہیں ایمان بالغیب۔ جو نتائج فوری طور پہ سامنے نہ آئے ہوں لیکن اس بات کا یقین ہو کہ ایسا ہو کر رہے گا' یہ ایمان بالغیب ہے۔ یہ غیب کس چیز پہ ہے' کس بات کا ہے؟ اس بات کا ہے کہ وہ بیج صاحبِ ارادہ نہیں کہ جی چاہے اُگ گیا' جی چاہے نہ اُگا' وہ مجبور ہے کہ اسے قانون کے تابع چلنا ہے۔ وہ اپنی مرضی سے نہیں چل سکتا۔ وہ قانون کے ہاتھوں مجبور ہے: زمین صحیح ہے' بیج اچھا ہے' کھاد دی گئی ہے' وقت پر پانی دیا گیا ہے' بیج صالح ہے' اس کے بعد رکھوالی کی گئی ہے' دھوپ اس کو ملتی ہے' ہوا اس کو ملتی ہے' پانی ملتا ہے' رکھوالی ہوتی ہے۔ یہ زراعت سے متعلق سارے قانون ہیں۔ ان قوانین کے تابع وہ بیج رکھا ہوا ہے' جو چل رہا ہے۔ اب اس کو یہ اختیار نہیں ہے کہ ان کے خلاف کچھ کرے۔ اس بیج سے قرآن کے الفاظ میں سو سو دانے پیدا ہو کر رہیں گے۔ یہ جو اپنی محنت کے اَن دیکھے نتیجے پر ایمان ہے' یقین ہے' اسے کہتے ہیں ایمان بالغیب۔

صبر کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! قرآن نے شروع ہی میں کہا ہے کہ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ [1] (2:3)۔ یہ ہر کوشش کے لیے ہے۔ پہلے ہی دن یہ کوشش برومند نہیں ہو جاتی' بڑا لمبا عرصہ لگتا ہے' روز محنت اور مشقت ہوتی ہے' نتیجہ سامنے نہیں آتا لیکن جن قوموں کو ان قوانین کا علم ہے' جن کی رو سے وہ کام کر رہی ہیں' انہیں اس کا یقین ہوتا ہے کہ یہ نتیجہ خیز ہو کر رہیں گی۔ وہ نہ تھکتی ہیں' نہ گھبراتی ہیں' نہ مایوس ہوتی ہیں' نہ اسے درمیان میں چھوڑ دیتی ہیں۔ یہ ہے جسے قرآن نے صبر کہا ہے۔ صبر کے معنی یہ نہیں ہوتے جو ہمارے ہاں رائج ہیں کہ جب کچھ نہ ہو سکتا ہو' بے کسی' بے بسی اور لاچارگی ہو' کچھ نہیں ہو سکتا: ''نی بہن صبر کر' ہن

---

[1] وہ اُن حقیقتوں پر یقین رکھتے ہیں جو نگاہوں سے اوجھل ہیں اور صحیح روش کے اُن نتائج پر بھروسہ رکھتے ہیں جو اگرچہ ابتداءً ان کی نظروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں لیکن جن کا آخرالامر سامنے آجانا یقینی ہوتا ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

ہو کی سکدا ہیگا۔ بہن ای نئیں' بھراواں نوں وی تے ایہوای کیا جاندا اے کہ میاں! صبر کرو۔'' [1] قسمت کا لکھا جھولی میں

آ گیا' اب کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ ہمارے ہاں یہ صبر ہے۔ قرآنِ کریم میں صبر کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح وہ کسان مہینوں چلا جاتا ہے' مسلسل متواتر استقامت کے ساتھ' اسے کہتے ہیں صابر۔ کہا کہ یہ جو ایمان بالغیب ہے' یہ صبر کا متقاضی ہے۔ یاد رکھو! اس پہ یقین ہونا چاہیے۔ یہ چیز جو قرآن نے کہی ہے کہ اِنَّہٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (6:21) ظالم کی کھیتی پنپ نہیں سکتی۔ یہ اس نے ایک قانون دیا' اصول دیا ہے اور اس کے لیے لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ (6:34) کہا ہے کہ اس میں تبدیلی نہیں ہوگی۔ مظلوم کو یقین ہونا چاہیے کہ ایسا ہو کر رہے گا لیکن ایسا ہوگا کیسے؟ یہ ان قوانین کے ماتحت ہوگا جو قرآن نے بتائے ہیں: یہ کرو گے تو پھر ظالم کی کھیتی اجڑے گی اور اگر تم بھی اس ظالم کے ساتھ شریک ہو جاؤ گے تو پھر ظالم کی کھیتی رات دوگنی اور دن چوگنی بھی پکے گی۔ یعنی یہ یقین کہ ظلم کی کھیتی پنپ نہیں سکتی' یہ ہے وہ جو اس کسان کو دانے کی برومندی پر یقین ہے اور پھر اس کے آگے وہ عمل شروع ہوتا ہے۔

کوئی عمل فوری طور پر نتیجہ خیز نہیں ہوتا

عزیزانِ من! انسانوں کے متعلق قرآن نے جتنے بھی قوانین بتائے ہیں ان میں بھی یہ صورت ہے کہ وہ اسی دن نتیجہ خیز نہیں ہو سکتے۔ یہ جو روز آ کے شکایتیں ہوتی ہیں کہ صاحب! کہا جاتا ہے کہ خدا عادل ہے' انصاف کرتا ہے' ظالم پنپ نہیں سکتا' ہم روز دیکھتے ہیں کہ ظالم پنپتا ہے' بے ایمانی کرنے والے دن بدن دولت کے انبار اکٹھے کرتے جاتے ہیں' کوئی کاروبار دیانتداری سے چل ہی نہیں سکتا۔ یہ سارا کچھ کیا ہے؟ ہمیں خدا کے ان قوانین پر ایمان نہیں۔ اور پھر یہ قوانین نتیجہ خیز کیوں نہیں ہوتے؟ ہم اس کسان کی طرح نہیں ہیں جو چھ مہینے محنت کرتا ہے' قانون کے مطابق عمل کرتا ہے' پھر کہیں جا کر اس کا عمل نتیجہ خیز ہوتا ہے۔ ہم تو گھر میں بیٹھے رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ صاحب! اگر خدا کا قانون ہے کہ ایک دانے سے سو سو دانے اُگیں گے تو جس دن اگیں گے ہم جا کے ان کو لے لیں گے۔ یوں نہیں ہے۔ تو یہ ہے جسے ایمان بالغیب کہا جاتا ہے۔ ہر وہ محنت کار' ہر وہ مزدور' ہر وہ صنعت کار جسے یہ یقین ہے کہ میں جو کر رہا ہوں' جو مشین میں بنا رہا ہوں' جو کلاک میں فٹ کر رہا ہوں' پتہ نہیں اس پہ چھ مہینے لگ جائیں' سال لگ جائے لیکن ایک دن یہ چلتا ہوا بن جائے گا اور اس کا اتنا کچھ مل جائے گا' وہ روز فاقے کاٹ کے بھی اس کے پیچھے لگا رہتا ہے۔ یہ یقینِ محکم اور عملِ پیہم ہے اور یقینِ محکم خدا کے قوانین کی محکمیت پر ہے

---

[1] اے بہن! صبر کرو' اب کیا کیا جا سکتا ہے؟ بہنوں کو ہی نہیں' بھائیوں کو بھی یہی کہا جاتا ہے کہ میاں! صبر کرو۔

کہ وہ غیر متبدل ہیں یقیناً ایسا ہوگا جو قرآن کہتا ہے۔ ہم نے ان کی تکذیب کی ہے۔ تکذیب یہ ہے کہ ان میں وہ یقین باقی نہیں رہا۔ انہوں نے یہ کہا کہ نہیں صاحب! جھوٹ ہے' ہم نے دیکھا ہے بے ایمان سب سے زیادہ پنپتا ہے' جو بد دیانت دوکاندار ہوتا ہے وہ دیکھیے کیسے Flourish (پھلتا پھولتا) کرتا ہے۔ یہ ہے تکذیب خدا کے قوانین کی۔ جب یہ صورت ہو جائے گی تو پھر وہ کچھ دیانتداری کے لیے کام کرنے پہ آمادہ ہی کیسے ہوسکتا ہے۔ اَن دیکھے نتائج پر یقین: یہ ہے ایمان بالغیب۔ یہاں کہا کہ اِنَّ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّھُمْ (67:12)۔ اس کا ترجمہ ہوگا ''جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔'' یہ ڈرنا اور خوف کھانا کیا ہے؟ یہ بھی سوچنے کی چیز ہے۔

بچپن سے ہی خوف و ہراس

آج کی سائیکالوجی میں تو یہ ڈرنا اور خوف کھانا ایک طرف رہا' قرآن کہتا ہے کہ وہ جو ہمارے قوانین کے مطابق امت تیار ہوگی' معاشرہ تیار ہوگا' جو مومن ہوگا ان کی پہلی صفت یہ ہے کہ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ (2:38) ان پہ خوف وحزن ہی نہیں ہوگا اور یہاں ہمارے ہاں بچپن سے' پہلے ہی دن سے' جو اللہ میاں سے ڈرانا شروع کیا جاتا ہے کہ بس وہ اللہ میاں آپ کے لیے بالکل خوف کا مجسمہ بن جاتا ہے: ڈر' ڈر' ڈر۔ او ڈر سے تو انسانیت کچلی جاتی ہے۔ یہ الفاظ ہیں: یخشون ۔ خشیٰ کے اس لفظ میں بات ڈر کی نہیں ہوتی۔ یہاں ہے: ھُمْ مِّنْ خَشْیَةِ رَبِّھِمْ (23:57) جہاں بھی اللہ' رب کے لیے' قرآن یہ کہتا ہے' اس کے معنی ہیں ''ان قوانین کی خلاف ورزی کرنے سے جو نتائج برآمد ہوتے ہیں' ان سے مجتنب رہو' ان سے ڈرو' ان سے خوف کھاؤ کہ اس کے اس کلام کی خلاف ورزی کی تو ہم تباہ ہو جائیں گے۔ یہ ہے ڈرنا۔ یہ بالغیب ڈرنا ہے کہ فوری طور پہ تمہارے سامنے یہ تباہی نہیں آ جائے گی۔

مہلت کا وقفہ خدا کی رحمت ہے

قرآن میں بیشمار مقامات پہ ہے کہ مخالفین نبی اکرم ﷺ سے بار بار کہتے ہیں' ہر نبی سے یہی کہتے تھے کہ جس تباہی کے لیے تم ڈراتے ہو وہ ہم پہ لاؤ' جلدی کرو' لاؤ' لاتے کیوں نہیں ہو؟ اللہ تعالیٰ نے اس پہ کہا ہے کہ یہ خدا کی اس رحمت کو Realise (محسوس) نہیں کرتے' محسوس نہیں کرتے کہ غلط کاری کے اعمال میں ہم فوری گرفت نہیں کرتے۔ غلط کاری کے اعمال اور ان کے نتائج کے درمیان ایک مہلت کا وقفہ ہوتا ہے اس لیے کہ شاید یہ لوگ سمجھ جائیں۔ سمجھنے کے بعد اپنی غلط روش کو چھوڑ دیں' صحیح روش اختیار کر لیں تو پھر یہ تباہی سے بچ جائیں گے۔ قرآن نے کہا ہے کہ اگر تم یہ کر لو تو اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ

مجھے کیا پڑی ہے کہ پھر میں تمہیں عذاب دوں' مجھے کوئی اس چیز میں مزا تو نہیں آتا۔ تو یہ جو مہلت کا وقفہ ہوتا ہے' یہ بھی قانونِ مکافاتِ عمل کا ایک لاینفک جزو ہے اور واقعی خدا کی رحمت ہے۔ جس دن ذرا سی بدپرہیزی کی جائے' اگر اسی دن سرطان ہو جائے تو پھر تو کوئی بچ ہی نہیں سکتا۔ اس وقفے میں' اس مہلت کے دوران' چھوٹی چھوٹی Symptoms (علامات) سامنے آتی ہیں: اس سے اندازہ لگ سکتا ہے۔ اگر تم توجہ سے غور کرو کہ میں نے یہ بدپرہیزی کی تھی' اس سے ایسا میرے اندر کچھ ہو رہا ہے تو اس دوران میں جو مہلت کا وقفہ ہے' تم علاج کر سکتے ہو' اصلاح کر سکتے ہو۔ اور اگر فوری گرفت ہو جائے تو کوئی بچے ہی نہیں۔ قرآن نے کہا ہے کہ اگر ہم فوراً پکڑنے لگ جائیں تو دنیا میں کوئی انسان باقی ہی نہ رہے۔

مغفرت کا مفہوم

عزیزانِ من! کون ہے جس سے بدپرہیزی نہیں ہوتی؟ اس نے بدپرہیزی کے بعد اس کا علاج بھی رکھا ہے' اصلاح کا سامان بھی رکھا ہے' عقل وفکر بھی تمہیں دی ہے' صاحبِ اختیار بھی بنایا ہے۔ یہ ہے وہ چیز جس کے لیے وہ انہیں بالغیب ڈرنے والے کہتا ہے۔ ان کے لیے لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ كَبِيْرٌ [1] (67:12) کہا ہے۔ کیا بات ہے! ہمارے ہاں مغفرۃ کے ترجمے کے لیے بخشش کا لفظ آتا ہے۔ وہ فوراً بخشش کے اوپر آ گئے' ان فقیروں اور گداگروں کا بخشش کے بغیر کام ہی نہیں چلتا ہے۔ اِن کے ہاں تو بہشتِ فی سبیل اللہ است۔ یہاں کی ایک چیز گداگری تو الگ رہی' بخشش کی دعا کرتے رہو' اللہ میاں سے بہشت بھی ہمیں بخشش میں مل جائے گا: جا جھولیاں پھیلا دے' جا' بابا! تیرا بھلا ہو۔'' اوہن کہے گا: پا بھئی! ٹوکری دے وچ لیکن اوتے باسی روٹی دیندے ہوندے نیں فقیرنوں۔'' [2] نہیں' میرے عزیز! مغفرۃ Protection (حفاظت) ہے' حفاظت ہے۔ یہاں کہا ہے کہ انہیں اپنے غلط قدم کے نتائج برآمد ہونے سے حفاظت مل جاتی ہے۔ تباہی کے وہ نتائج جلدی نہیں برآمد ہوتے' اصلاح کے لیے وقفہ دیا جاتا ہے۔

مغفرۃ کیسا عجیب لفظ ہے! یہ وہ چیز ہے جسے Preventive (حفظ ما تقدم) کہتے ہیں۔ یہ Medicine (علم ادویات) کی اصطلاح میں ایسی چیزیں ہیں جو حفاظت کا سامان بہم پہنچاتی ہیں تاکہ کسی قسم کا کوئی نقصان ہی نہ ہو۔ اسے

---

[1] ان کے لیے ہر قسم کی تباہیوں سے بچنے کا سامان ہے' اور ان کی محنتوں کے نہایت شان دار نتائج ہیں۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

[2] وہ اب کہے گا کہ بھئی! اب میری ٹوکری میں ڈال دو۔ لیکن وہاں تو فقیر کو باسی روٹی دیتے ہیں۔

مغفرت کہتے ہیں۔ یہ Preventive (حفظ ماتقدم) بڑی چیز ہوتی ہے۔ یہ ہے وَ اَجْرٌ کَبِیْرٌ (67:12)۔ اگر انسان یہ کچھ کرے تو پھر وہ بہت بلند نتائج ہیں جو برآمد ہوتے ہیں' Protection (حفاظت) بھی ملتی چلی جاتی ہے اور اس کے نتائج بھی بہت بلند و بالا برآمد ہوتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ سب کچھ ہوگا کیسے؟ اس کے لیے قرآن کریم نے کہا کہ وَاَسِرُّوْا قَوْلَکُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ (67:13) لیکن یہ چیزیں اس طرح نہیں حاصل ہوسکتیں کہ تم زبان سے ان قوانین کا احترام کرتے رہو اور دل میں ان کے خلاف پروگرام بناتے رہو۔ اس طرح تم خدا کو دھوکا نہیں دے سکتے۔ تم اپنے ارادوں کو ظاہر کرو یا مخفی رکھو' خدا کے نزدیک یکساں ہے۔ اپنے اعمال کے لیے قرآن انسان کے بااختیار وارادہ ہونے یا ذمہ دار ہونے کی بات کہتا ہے۔ وہ یہی نہیں کہتا کہ جو ظاہر میں تمہارے اعمال سامنے آجائیں وہی جرم یا وہی نتیجہ خیز ہونگے۔ اس نے تو یہ بھی کہا ہے کہ دل کا ہر ارادہ اور نگاہ کی ہر خیانت کے بھی نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ دل کے ارادے ہی سے تو جرائم کی ابتداء ہوتی ہے۔ یہ تخم ہوتا ہے اور بات ہی یہ ہے۔

پہلے ارادہ' پھر عمل' پھر اس کا نتیجہ

عزیزانِ من! بات ہی ارادے سے چلتی ہے۔ انسان پہلے ارادہ کرتا ہے تو پھر اس کے بعد اس کے لیے قدم اٹھاتا ہے۔ قرآن کا قانونِ مکافاتِ عمل یہ ہے کہ وہ ارادے پہ بھی گرفت کرتا ہے اور اگر واقعی ارادے پہ گرفت ہوجائے اور انسان وہیں رک جائے تو جرم سرزد ہی نہ ہو۔ اب سوال یہ ہے کہ ارادے پہ کنٹرول کس طرح سے ہوتا ہے؟ یہ کنٹرول صحیح تعلیم سے' صحیح تربیت سے ہوتا ہے۔ اس تعلیم سے اگر دلوں کے اندر یہ یقین پیدا ہوجائے کہ یہ جرائم ہیں' ان کا ارتکاب نہیں کرنا' مجھے اس کی سزا ملے گی۔ اگر انسان کے اندر کی یہ آواز ہوجائے تو جرائم رک جائیں گے۔ اسی لیے قرآنِ کریم نے یہ تعلیم دی تھی۔

باہر کی بیڑیاں نتیجہ خیز نہیں ہوتیں

عزیزانِ من! رسول اللہ ﷺ کا بھی یہ فریضہ بتایا کہ یُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ [1] (62:2)۔ انہوں نے قانون کی تعلیم دی اور قانون کی علت وغایت بتائی کہ یہ قانون کیوں ایسا بنا ہے۔ اِس قسم کی تعلیم کے ذریعے سے

---

[1] یہ رسولؐ ان کے سامنے قوانین خداوندی کو پیش کرتا ہے پھر انہیں سمجھاتا ہے کہ ان قوانین کی غرض وغایت کیا ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

رسول اللہ ﷺ نے وہ امت تیار کی تھی۔ سب سے پہلے اگر کسی کو کسی معاشرے میں اصلاح مطلوب ہے تو اس میں تعلیم و تربیت یہ ہونی چاہیے۔ قرآنِ کریم کے مطابق یہ چیزیں دل کی آواز بن کر اوپر آئیں کہ یہ جرم ہے' یہ نہیں کرنا۔ باہر سے بیڑیاں پہنانے سے تو کچھ نہیں ہوتا ہے۔ جتنا جی چاہے سخت بیڑیاں پہنا دیجیے' اصلاح نہیں ہوگی۔ یہ کہا کہ بات عمل سے سامنے آئے خواہ وہ ابھی تمہارے دل کا ارادہ ہی کیوں نہ ہو۔ یقین کرو یہ دونوں یعنی عمل اور دل کا ارادہ نتیجہ خیز ہوتے ہیں۔ اسی لیے اس نے کہا ہے کہ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ❶ (67:13)

معاشرتی عدل کی کیفیت اور حیثیت

عزیزانِ من! قرآن یہ کہتا ہے کہ خدا وہ جج ہے جو تمہارے دل میں گزرنے والے خیالات سے بھی واقف ہے۔ جہاں تک ہمارے ہاں معاشرتی عدل کا تعلق ہے یہ بھی نظامِ عدل ہمارے ہاں ہوتا ہے۔ اس میں تو جو جرم محسوس طور پر سرزد ہو جائے اور سامنے آ جائے اور اس کے لیے شہادات ہوں' وہی جرم جرم قرار پاتا ہے۔ دل کے ارادے کے اوپر گرفت نہیں ہوتی لیکن میں نے عرض کیا ہے کہ یہ قانون تو ہمارے ہاں کا معاشرتی نظامِ عدل ہے۔ خدا کا نظامِ عدل تو اس کا محتاج نہیں ہے کہ اس قسم کی شہادات بھی لی جائیں' اس قسم کے Judges (منصف) مقرر کیے جائیں۔ وہ تو دل کے خیالات' جو ہنوز ارادے ہیں' ان پہ بھی نگاہ رکھتا ہے۔ وہ اصلاح کا کام ارادوں سے' خواہشات سے' اور آرزوؤں سے' شروع کرتا ہے اور اگر وہ بدل جائیں تو پھر اس کے بعد تو آپ سمجھیے ساری دنیا بدل جاتی ہے۔ اِسی لیے کہا کہ خدا تو تمہارے دل میں گزرنے والے خیالات سے بھی واقف ہے اور دلیل سن لیجیے۔ کیا عجیب دلیل ہے! کہا کہ اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ (67:14) کیا جس نے پیدا کیا ہے وہ اس کو نہیں جانتا کہ اس کے اندر کیا ہے؟ کیا دلیل ہے! ہر وہ شخص جس نے اپنی کوئی مشین بنائی ہے اگر اس سے آ کر کہا جائے کہ صاحب! اس میں کچھ ذرا سی یوں رڑک سی پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح کلاک بنانے والے سے کہا جائے کہ صاحب! وہ کوئی چار دن کے اندر ایک سیکنڈ کا فرق کرتا ہے وہ فوراً ذہن میں سمجھ جائے گا کہ فلاں مقام کا جو ایک پرزا ہے وہ صحیح کام نہیں کرتا۔ وہ کیوں فوراً سمجھ جائے گا کیونکہ اس نے اسے بنایا ہوا ہے۔ قرآنِ کریم کی کیا دلیلیں ہیں کہ جس نے انسان کو پیدا کیا ہے کیا وہی نہیں جان سکتا کہ اس کے دل میں کیا پیدا ہوا ہے۔ اس کے سوا تو کوئی اور جان نہیں سکتا کہ کسی نے انسان کو پیدا نہیں کیا اور وہ ہے وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ (67:14)۔ کوئی اس کا کیا ترجمے کرے گا! قرآن کے الفاظ

---

❶ وہ تو دل کی گہرائیوں میں گزرنے والے خیالات تک سے واقف ہے۔ (ایضاً)

کے ترجمے نہیں ہو سکتے۔ اب یہ جو لطیف لفظ ہے' ہمارے ہاں اس کے معنی ''نرم و نازک'' کے سوا اور کیا کیے جائیں' ہم اس کے لیے لطافت کہہ دیں گے۔ کہہ دیں گے کہ بہت لطیف ہے' ملائم سا ہو جائے گا۔ انگریزی زبان کے اندر وہ Subtle سی ایک چیز ہے کہ جو بظاہر محسوس نہ ہو لیکن اُسے محسوس کر لیا جائے۔ یہ جو اس طرح سے محسوس کرنے والی نگاہ ہے بس یہ وہی ہے۔ اس کے لیے میں ایک شعر پڑھا کرتا ہوں کہ

کیسے بتائے کوئی خون آرزو کیا ہے
انہیں یہ ضد ہے کہ دیکھیں گے رنگ و بو کیا ہے

خونِ آرزو کا کوئی رنگ و بو نہیں ہوتا لیکن خونِ آرزو کو تو وہ نگاہیں پہچان سکتی ہیں جو بصارت کے علاوہ بصیرت بھی رکھتی ہیں۔ کسی چیز کو جو یوں پہچاننا ہے یہ لطیف ہوتا ہے۔ رنگ و بو سے خونِ آرزو نہ پہچانیں' یہ پہچان لیں کہ ہاں' آرزو کا خون ہوا: وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ (67:14)۔ یوں باخبر تو دوسرے بھی ہو سکتے ہیں۔ کیا بات ہے قرآن کے ایک ایک لفظ کی!

عزیزانِ من! خبیر تو اور بھی ہو سکتے ہیں' باخبر اور بھی ہو سکتے ہیں مگر یہ جو لطیف ہونا ہے یہ ہے اصل چیز کہ نگاہ ایسی ہونی چاہیے اور یہیں سے یہ بھی چیز آ گئی ہے کہ جو قرآن کے مطابق عدل کرنے والے ہیں انہیں حدِ انسانیت کے اندر' امکانِ انسانیت کے اندر' لطیف بھی ہونا چاہیے' انہیں نگاہوں سے بھی پہچاننا چاہیے۔

مومن کی فراست کی خصوصیات

عزیزانِ من! قرآن نے کہا ہے کہ ایسا انداز ہو کہ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ (55:41) مجرم اپنی پیشانیوں سے پہچانے جائیں۔ یہ نگاہیں ہونگی۔ قرآن سے مومن کو یہ فراست پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ جو ایک حدیث نبی اکرم ﷺ کی ہے' چمکتی ہوئی ہے: مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ اور اللہ کا نور تو قرآن ہے۔ اس نے قرآن کو نور کہا ہے۔ اس سے یہ فراست پیدا ہو جاتی ہے۔ اب ہمارے ہاں لطیف سے لطافت ہی تو بنتی ہے کہ اس میں لطیف ہونے کی' بشریت کی حد تک' ایک خصوصیت ہو یعنی یوں کہیں گے کہ خدا کی جو صفات ہیں وہ تو کلی اور مطلق ہوتی ہیں' لا انتہا ہوتی ہیں' انسان کو اس درجے تک تو حاصل نہیں ہوتیں لیکن اس کے رنگ میں رنگے جانے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ بحدِ بشریت وہ چیز انہیں حاصل ہو اور یاد رکھیے! جس فرد میں یہ حاصل ہوتی چلی جائیں گی وہ مومن بنتا چلا جائے گا اور جس معاشرے میں' نظام میں' مملکت میں' یہ چیزیں حاصل ہوتی چلی جائیں گی' صفاتِ خداوندی حاصل ہوتی چلی جائیں گی' اسی کو اسلامی نظام کہیں گے' وہی قرآنی مملکت ہو گی۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ الملک کی آیت 14 تک آ گئے' 15 ویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

❀.....❀❀❀.....❀

SOCIAL VALUE SYSTEM

By

Maj Gen (Rtd) Ihsan-ul-Haq

The Quran envisages the life of man as a part of a society. The complete potential of human beings can only be achieved when they live a collective life and inter act with each other. To enable them to live in harmony with each other, they would be well advised to frame a complete code of discipline, living within which, individuals pursue their preferred activities. In this chapter, we will discuss the Quranic values concerning the social sphere. For convenience and clarity, values concerning politics, economy, war and peace, family affairs etc have been discussed separately although they are all a part of social living. There may well be, therefore, a little repetition. We will try to keep it to the minimum.

To avoid constant conflict, God suggest that human beings should agree to the structure of a single code of discipline, the abiding principles of which God has given to humanity through Ambiyas.

"O mankind, obey the injunctions given by your Nourisher Who has created you and those before you… " 2/21.

God is not asking for worship. He is not asking for you to utter some words in His praise or to go through some movements to show obedience. He is asking for demonstrable actions which would allow a society to live together in a peaceful manner. For formulation of a code of life for their times and space, the Quran asks believers to establish *Salat:*

"(The true Muslims) are those who, when established a free and independent state, set up a system of life in which they follow the Laws of Allah in all spheres and provide means of growth to people …" 22/41.

It will be noted that *Salat* system can only be established when Muslims live in a sovereign State where collective laws, made within the divine value system, would enable people to order their individual lives also in accordance with Islam. Muslims living in a minority in a State with a non-Muslim majority are not even asked to establish a *Salat* system.

The best that the Muslims can do in such a circumstance is to live as model citizens, in conformity with the laws of the State in which they live and trying, as a community, to bring about decency in laws where it does not exist. Interaction in society starts with life at home at first. It then expands into individuals' relations with neighbours, with the community and with the world at large. Home life is considered of great importance for growth of humanity. This is the foundation on which peace and prosperity in the world is built. That is why the Quran gives a fair amount of detail in respect of broad values concerning life at home.

Let us start from the beginning. In a normal, healthy society, parents take care of their infants. The Quran takes that for granted and goes on to exhort the parents to provide the fullest opportunity to their children for their growth and not deprive them of their right to education, health etc. If, for any reason, the parents seem to fail in this duty, it is the duty of the State to step in and ensure that the children get their right.

"And do not deprive your children of education, health and other necessities of growth for fear of poverty. We provide for them and for you. Their deprivation is a very big failing on your part…" 17/31.

The children are also asked to be decent to their parents especially when they have become old and require all the love, affection and, if necessary, means of living.

"And we have enjoined on man concerning his parents; his mother bears him with faintings upon faintings and his weaning takes two years. But if they (Parents) strive to persuade you to obey other than one God, you are not obliged to obey them, but, in spite of that be decent to them and do your duty towards them in accordance with the law of the land …" 31/14-15.

It will be noted that obedience to parents is enjoined only when they guide the children towards good. But differences on a value system do not entitle the children to look down upon their parents.

"And your God has decreed that you serve none but Him and do good to parents. If either or both of them reach old age with you, say not "Fie" to them, nor chide them, and speak to them a generous word. And lower to them the wing of humility for nourishment and say: "My Nourisher, have for nourishment on them as they brought me up when I was little …"17/23-24

The trouble that the mother, in particular, takes to bring up her children is further stressed in chapter 46 of the Quran:

"We have enjoined on man the doing of good to his parents. His mother bears him with trouble and she brings him forth in pain. And, the bearing of him and the weaning of him is thirty months. Till, when he attains his maturity and reaches forty years, he says: "My Nourisher, grant me that I may give thanks for favour which You have bestowed on me and on my parents, and that I may do good that pleases You and be good to me in respect of my offspring…" 46/15.

For a healthy and peaceful growth of society, the Quran lays great stress on a proper sexual behavior. Sex outside marriage is strictly prohibited.

"And avoid even the preliminaries of a sexual relationship outside marriage. This is a straying from the path of virtue and will, surely, lead to very disastrous consequences…" 17/32.

The Quran understands that men and women have to live and work together in all walks of life. At a certain age, there is sexual attraction between them. This is healthy. But sexual relationship must await marriage at a marriageable age. Men and women, therefore, should work together in such an environment when sex is not exhibited by any of them to divert their attention from productive work requiring their undivided attention. Exhibition of sex may also result in a temptation to indulge in illicit sex. Both parties are asked to avoid such a situation.

"Say to the believing men that they lower their gaze and restrain their sexual passions. That is purer for them. Allah is aware of what they do. And say to the believing women that they lower their gaze and restrain their sexual passions and do not display their adornments except what appears thereof. And let them wear their head coverings over their bosoms. And they should not display their adornments except their husbands or their fathers, of the fathers of their husbands, or their sons or the sons of their husbands, or their brothers or their household servants including male servants unfit for marriage or the children who know not women nakedness. And let them not strike their feet so that the adornment that they hide may be known …" 24/30-31.

Women are asked, in particular, not to exhibit sex while otherwise engaging in all activities, like education, working for a living in men's company etc. A little more guidance is offered to them in chapter 33 of the Quran:

"O Nabi, tell your wives and your daughters and the woman of believers to let down upon them their over garments. This is more proper, so that they may be known, and not be given trouble … 33/59.

Nowhere, in the Quran has been asked women to be confined to their homes. In fact, it is encouraging them to come forth and together with men, when necessary, to participate in all useful activities provided they are properly dressed. Notice that not many details of dress restrictions are laid down. Only the broad outlines and the principles underlying this injunction, are mentioned. After that, it is left to the discretion of men and women in all ages and in different countries to adopt dress habits to suit their circumstances, remaining, of course, within the broad restrictions prescribed. The necessity for not even preliminaries to a temptation for sex outside marriage is mentioned in chapter 24 of the Quran:

"O you who believe, let your household servants and those of you who have not attained to puberty, ask permission (before they enter your private quarters) of you

three times; before the morning prayer *(salat-al-fajer)*, and when you put off your cloths for the heat of noon, and after the prayers of night *(salat-al-i'shaa)*. These are three times of privacy for you; besides these there is no harm for you nor for them to move around. And, when the children among you attain to puberty, let them seek permission as those before them sought permission. And, as for women past child bearing who hope not for marriage, it is no harm for them if they put off their over clothes without displaying their adornment. And, if they are modest, it is good for them…." 24/58-60.

If women insist on exhibition of sex, they are to be prevented from doing so in accordance with law.

"And as for those of your women who are guilty of straying from the virtuous path by being indecent, call to witness against them four witnesses among you; and if they bear witness, confine them to houses until death takes them away or Allah opens a way for them. And if both men and women stray from the path of virtue and are indecent, punish them according to law. Of course, if they retrace their steps and adopt a decent course of action after their punishment, leave them alone…" 4/15-16.

It will be noticed that indecent behavior by both men and women is reprehensible. They should be tried in a court of law where proper evidence, at least four reliable persons, are to be produced. I may mention in passing that the general impression that the Quran has prescribed four witnesses to the act of sexual intercourse before illicit sex can be proved, is quite wrong. Four witnesses are required only for indecent behavior and unlawful exhibition of sex. This is a very fair requirement. Such an evidence can easily be provided. Once this act is proved in a court of law, only courts are authorized to award punishment as the law prescribes. A confinement to the house is punishment for women for as long as circumstances require. They might get married if they are not so already and lead a normal married life after confinement has brought home to them the seriousness of their offence. This should give a lie to those who claim that the Quran asks for women to be confined to their homes in the normal course.

The Quran emphasizes the role marriage plays in maintaining balance in society. It is also a means of spreading love, affection, mutual trust and understanding amongst people.

"And of His signs is this that He created mates for you from amongst yourselves that you might find quiet of mind in them and He put between you love and compassion …" 30/21.

Marriage is a contract between two individuals, a decision they arrive at freely of their own accord, witnessed by members of the society and countersigned by the competent authority set up by the state. So it becomes a solemn agreement not to be taken lightly. It can be broken when necessary like all other agreements, according to law only. The Quran talks of maturity as the age at which marriage can be solemnized.

"And keep a check on the growth of orphans until they reach the age of marriage …" 4/6.

This *'Balaghun Nikkah'* ---------- reaching the age of marriage, is further specified in 6/153 as reaching an age at which boys and girls achieve full strength and are mature. This is further confirmed in 17/34 as follows;

"And do not draw nigh to the orphans property except in a goodly way till he attains his maturity…" 17/34.

I am emphasizing this point to eliminate belief among some people that Islam allows child marriage so long as guardians agree. This is an entirely wrong impression. In fact, it would be against Quranic injunctions when it lays down in 4/3 for men and 4/19 for women to choose their mates of their own free will.

"Marry the women of your choice…" 4/3

"It is not permissible for you to marry women forcibly …" 4/19

These two passages will come up for a detailed discussion later.

The Quran does not specifically lay down a written agreement in the case of marriage but as such a solemn agreement entails heavy responsibilities on the part of both the contracting parties, it would be advisable to reduce it to writing. The Quran has, on many occasions, laid down that all business agreements should be reduced to writing and witnessed by reliable people. A marriage contract has many implications and it stands to reason that in order to comply with them, its details must be fully described in writing to avoid any complications in the future.

In normal circumstances, the Quran recommends monogamy. If such a situation arises, and, unfortunately, it does too often as a result of wars, that there are far too many

women of marriageable age in proportion to men, polygamy is allowed under certain conditions.

"And if you fear that you will not be able to do justice to a lot of women marriageable age (that is there will not be enough men due to some reasons), marry such women as seem good to you, two or three or four. But if you fear that you can not afford more than one, then stick to the normal, that is one man one wife or slave girl (for as long as slavery was in vogue). Monogamy is more normal condition in which you can do justice to marriage as an institution…" 4/3.

If a man, in such emergent circumstances, wants to marry more than one wife, it might restore some balance in society and reduce the number of unmarriageable women to a reasonable proportion. Also, if some women are desperate to have children of their own they can legitimately do so. But will the man be able to do full justice to marriage in all respects? The Quran, logically, appreciates that it is not possible to do so in full.

"And you can not do justice between multiple wives even though you wish it, so be not disinclined from one with total disinclination, so that you leave her in suspense …" 4/129.

If for some demographic reasons, men face the same problem, that is there are far more men of marriageable age in a society in proportion to women, they (the men) are asked to live with such a situation until it improves.

"And let those men who can not find a match, keep chaste until Allah makes them free from want out of His grace..." 24/33.

Whereas, human beings must have food and drink to be able to live, they can live without sex. Men are asked to do exactly that. But in consideration for some women who may desperately want children of their own or security of a husband, and instinct (probably – I am a man and hence not sure) stronger than sex, Quran allows them to share a husband. But a man is not allowed to share a wife in an emergency because it would not be fair to the children. They will not know their fathers. I conclude from this discussion that polygamy as suggested by the Quran is concession to women for legitimate reasons. Of course, if men misuse a provision in law made for unusual circumstances, you can not find fault with the law. To afford full protection to women who, of their own free will,

wish to share a husband, the law of the land must specify in detail what minimum conditions must exist before such an arrangement can be sanctioned.

The Quran suggests a possible distribution of duties with regard to running a household.

"It is the duty of men to earn a living and provide for women because God has made some of them to excel others in various activities …" 4/34.

In normal circumstances, men should spend their energy in earning a living and women should work hard to manage the household and bring up children. This is not a matter of one being superior to the other. They both have a job of work to do and according to God, society will prosper in a peaceful manner if they distribute their load of work in this way. In no way does it mean that women are not allowed to go out and participate in useful activities or for that matter earning a living, when necessary.

"It is true that between men and women, God has made some of them to excel the other, but it does not mean that women can not go forth and earn a living when necessary. For men is the benefit of what they earn and for women is the benefit of what they earn …" 4/32.

In case, a woman does restrict her activities to management of the house and children, she must not remain economically completely dependent. When men marry, they must part with some of their income as an obligatory part of a marriage agreement to cater for women's economic requirements.

"And give to the women their marriage gifts as gracefully as a bee gives honey. This gift is, then, their property. If, of their own free will, they wish to give a part of it back to you, they can do so. Both of you together, consume this with enjoyment and pleasure …" 4/4.

The Quran suggests to men and women to marry good Muslims whenever possible. A congruity of faith and thoughts helps in maintenance of stability in married life. However, in a Muslim society where slavery has not yet been completely eliminated, Muslims are allowed to marry slaves. Of course, they become free immediately after such a marriage.

"And marry those among you who are single. They may be slaves or slave girls of good character (when slavery is still under elimination). If they are needy, Allah will make them free of want out of His grace …" 24/32.

The Quran looks upon the married state as the normal state. Insufficiency of means to afford a family must not force some people to remain single

The state must legislate in this connection, if necessary. Muslim men are encouraged to normally marry Muslim women of good character, whom they like. However, Muslim men and women are also permitted to marry men and women of the book.

"This day all good things are made lawful for you. And the food of the people of the book is lawful for you and your food is lawful for them. And, so are the chaste from among believing women and the chaste from among those who have been given the Book before you when you have given them their marriage gift, taking them for marriages, not fornicating nor taking them for paramours in secret …" 5/5.

The point with regard to *'Ahlul Kitab'* people of the Book, of course, is who exactly are they? Most Muslim scholars have, so far, been applying this term to only Christians and Jews. But I see no reason why other people who claim to have received divine message at one time or the other, should be excluded from this list. God has sent His message to every nation in the civilized world. Buddhists, Hindus and Parsees, amongst others claim to have been recipients of divine message. Sure, their books have since been tampered with. But the same has happened to Torah and Bible. Muslim scholars would, therefore, be well advised to revise their opinion about which people can be termed as the people of the Book.

The Quran also gives a list of people with whom marriage is not permissible.

"And marry not the Idolater until they believe and certainly a believing maid is better than an idolatress even though she pleases you. Nor give believing women in marriage to idolaters until they believe, and certainly a believing slave is better than an idolater, even though he pleases you …" 2/221.

Other categories of people are added in this list.

"Forbidden to you are your mothers, your daughters, your sisters, your paternal and maternal aunts, your brother's and sister's daughters, your mothers that have suckled you, your foster sisters, mothers of your wives, your step daughters who are in your guardianship born of your wives with whom you have had sexual intercourse; but if you have not done so, there is no blame for you, and the wives of your sons who are your own lions; and that you should have two sisters together, except what has already passed ; and all married women except whom your right hands possess (when slavery is not yet completely eliminated) are forbidden. This is Allah's ordinance to you. And lawful to you are all women besides those, provided that you seek them with your property, taking them in marriage, not committing fornication. So, to those from whom you profit after marriage, give them their marriage gifts as made binding on you. And, those of you who can not afford to marry free believing women, let him marry your believing slave maidens (when slavery is not yet completely eliminated). Marry such slave girls with the permission of their masters and give them their proper marriage gifts, according to law. Remember, no living with arrangements with free irresponsible sex. Also remember that if after marriage, such erstwhile slave girls exhibit sex, they should be given half the punishment awarded to free women …" 4/23-25.

Muslims are forbidden to marry such women as have been proved to have committed sex outside marriage.

"The adulterer can not marry except an adulteress or idol worshipper. Similarly, an adulteress can only marry an adulterer or an idol worshipper. Marriage with such people is forbidden for Muslims …" 24/3.

Also forbidden is marriage with your mothers.

"And marry not women whom your fathers married except what has already passed …" 4/22.

Once men and women have entered into a marriage relationship, they are asked to observe certain rules. The Quran gives only a few. Obviously, societies have to regulate these relationships in much more detail, not transgressing broad divine injunctions. Whereas, a sexual relationship is a source of great pleasure to men and women and vehicle for cementing an environment of love and affection, it must not be forgotten that the main object of such relationship is to produce children. If this was not done, human race would come to an end.

"Your wives are a tilth for you, so go into your tilth when you like. (But reproduction is not the only aim in life). Your real aim is the growth of your personality …" 2/223

Nothing should be done which inhibits the development of your personality; howsoever tempting it may be for the body to indulge in entertainment. Creation of a balance between these two legitimate requirements leads to a consideration of family planning. As discussed earlier, it is a couple's duty to provide for the growth of their children in all respects in a decent manner (6/152). They must, therefore, plan a family keeping in view their own resources as well as national resources, when need be. It would not add to their stature if they produce children who could not be adequately looked after by themselves or they would be burden that the national resources could not cope with.

(Continued)

****